مختصر تذکرۂ مصنف

ہندوستان میں مغربی تعلیم کے علمبردار اور دُنیائے اسلام کے جلیل القدر فرزند سر سید احمدؒ خاں علیہ الرحمتہ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۸۱۷ء کو بمقام دہلی دارالخلافہ میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندانِ سادات میں سے تھے۔ اور خاندان نبوت کے انتساب کے لحاظ سے ان کا نسب حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے سر سید احمد علیہ الرحمتہ کے آباؤ اجداد بنی اُمیہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور سب سے پہلے دامغان میں آکر پناہ گزیں ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد دامغان چھوڑ کر ہمدان اور پھر ہرات میں وارد ہوئے اور وہیں قیام کر لیا۔

شاہجہان رحمتہ اللہ علیہ کے زمانۂ حکومت میں اس خاندان کے افراد ہندوستان آئے اور اپنی ذاتی قابلیت و لیاقت کی وجہ سے اعلٰے مناصب پر سرفراز ہوئے۔ سر سید احمدؒ علیہ الرحمتہ کے دادا سید ہادی عالمگیر ثانی کے دربار میں ایک بارسوخ اور صاحب اثر درباری تھے۔ اور ان کے والد سید میر تقی دربار مغلیہ میں ایک بہت بڑے عہدے پر ممتاز ہوئے۔

سر سید علیہ الرحمتہ بدقسمتی سے بچپن ہی کے زمانہ میں اپنے

والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے ان کی والدہ عزیز النسا بیگم بڑی قابلیت اور لیاقت کی عورت تھیں اور سرسید علیہ الرحمۃ کی تعلیم و تربیت اپنی والدہ ہی کی رہین منت ہے۔ اور یہ اسی باکمال عورت ہی کا فیض سرپرستی تھا جس نے انہیں دُنیا کا ایک مشہور و معروف انسان بنا دیا ؎

عزیز النسا بیگم عربی۔ فارسی پر پورا پورا عبور رکھتی تھیں اور اپنے زمانہ کی فاضلہ عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ سرسید علیہ الرحمۃ نے عربی فارسی کی تحصیل اپنی والدہ ہی سے کی تھی۔ اور یہ اپنی والدہ کی ہدایت کے مطابق دہلی کے مشاہیر فضلا و شعرا کی صحبت سے مستفیض ہوئے تھے۔ اور جب تک انکی والدہ زندہ رہیں اُنہوں نے ایک قدم بغیر اُن کے مشورہ کے نہیں اُٹھایا ؎

۱۸۳۸ء میں جبکہ انکی عمر بیس برس کی تھی یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوئے اور دس برس کا زمانہ منقضی ہونے پر صدر امین دہلی کے منصب پر سرفراز ہوئے ؎

یہ وُہ وقت تھا جبکہ انہیں اس بات کا پورا پورا موقع ملا کہ وُہ دارالخلافتہ کی گذشتہ شوکت و عظمت کے متعلق اپنی علمی تحقیقات کو عملی جامہ پہناتے۔ اُنہوں نے اس فرصت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور دارالخلافتہ کی قدیم عمارات اور دوسری تاریخی یادگاروں کے متعلق ایک کتاب آثار الصنادید کے نام سے تصنیف کی اور اس بیش بہا تصنیف کے صلہ میں

رائل ایشیاٹک سوسائیٹی کے فیلو مقرر ہوئے - اور دربار مغلیہ
سے نواب جوالدولہ عارف جنگ کا خطاب حاصل کیا اس کے
کچھ عرصہ بعد اس کتاب (آثار الصنادید) کا ترجمہ مسٹر گارسن
ڈی - تاسی نے فرانسیسی زبان میں کیا ؛
۱۸۴۱ء میں انہوں نے امتحان منصفی میں نمایاں طور
پر کامیابی حاصل کی - اور مین پوری تعینات ہوئے ؛

غدر و مابعد غدر

کچھ سال بعد ہندوستان کا پر امن مطلع بغاوت وغدر کے
تاریک بادلوں سے مکدّر ہوگیا اس زمانہ میں سرسید احمد علیہ الرحمۃ
بجنور میں تھے اسباب بغاوت کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس میں
شک نہیں کہ انہوں نے برطانوی حکومت کی بیش بہا خدمات
سرانجام دیں اور نہایت جرأت کے ساتھ بہت سے انگریز
مردوں عورتوں اور بچّوں کی جانیں بچائیں ؛
فتنہ بغاوت کے فرو ہو چکنے کے بعد حکومت برطانیہ نے
ایک باغی سردار کی جاگیر جس کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے تھی
سرسید احمد علیہ الرحمۃ کو پیش کی لیکن ان کے ضمیر نے اس جاگیر
کے قبول کرنے کی اجازت نہ دی اور انہوں نے نہایت شکریہ
کے ساتھ حکومت کی اس نوازش کے قبول کرنے سے انکار کر
دیا - لیکن حکومت اس بات پر مصر تھی کہ انہیں انکی خدمات

کا کچھ نہ کچھ صلہ ضرور دیا جائے آخر بڑے اصرار کے بعد دو صد روپیہ ماہوار کی پنشن قبول کی جو ان کی دو نسلوں تک جاری رہی ۔

بغاوت کے بعد سر سید علیہ الرحمتہ نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان "اسبابِ بغاوتِ ہند تھا" - اور سر آکلنڈ کلوِن نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں چھپوایا - سر سید علیہ الرحمتہ نے اس پمفلٹ میں بغاوت کے پانچ مفصلہ ذیل اسباب بیان کئے ۔

(۱) حکومت کے ارادوں کے متعلق غلط فہمی
(۲) ملک کی حالت کے خلاف قوانین کا نفاذ
(۳) رعایا کی ضروریات اور شکایات کے متعلق حکومت کی بیخبری
(۴) راعی اور رعایا کے درمیان حقیقی دوستی کا فقدان
(۵) عسکری نظام کی خرابی اور لیجسلیٹو کونسلوں میں ہندوستانی ممبروں کی عدم موجودگی

سر سید احمد علیہ الرحمتہ نے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان سچی محبت اور دوستی کو قائم کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وُہ ایک حد تک ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو گئے اور باوجود نسلی و قومی اختلاف کے ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کا اظہار کرنے لگے ۔

انہوں نے ہندوستان اور انگلستان کے مشترکہ مفاد کیلئے بے مثال خدمات سرانجام دیں اور مشرق و مغرب کے درمیان

برادرانہ تعلقات کے قیام کیلئے سرتوڑ کوششیں کیں لیکن انکی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جو رہتی دنیا تک بطور یادگار کے رہے گا۔ ان کی وہ خدمت ہے جو انہوں نے مسلمانانِ ہندوستان کی تعلیم کے سلسلہ میں سرانجام دی۔ اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے اخلاقی اور معاشرتی درجہ کو بہت بلند کیا اور پھر اس زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کی کثرت انگریزی تعلیم کی مخالفت میں ایڑی چوٹی تک کا زور صرف کر رہی تھی ✧

مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی اور سرسید احمد علیہ الرحمۃ کی دُور رس نظر برطانوی ہند کے مسلمانوں کے مآل پر تھی انہیں صاف صاف معلوم ہو رہا تھا کہ زمانہ کسی اور بات کا متقاضی اور طالب ہے۔

مسلمانوں کا قدیم نصاب تعلیم جو قدیم منطق۔ فلسفہ۔ عربی۔ فارسی اور دینیات پر مشتمل تھا تعلیم جدید کی گرم بازاری کے سامنے رسوا ہو رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ:۔

سائینس و علوم جدیدہ کی کتابیں ان کیلئے سربمہر صحائف تھے جن تک ان کی رسائی نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اس پیکر استقلال نے باوجود کھلی مخالفت کے ۱۸۵۸ء میں اینگلو ورنیکل سکول کے نام سے ایک درسگاہ بمقام مراد آباد کھولدی جو بعد میں ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کے ساتھ شامل کر دی گئی۔ اس کے پانچ سال بعد جب یہ غازی پور میں بحیثیت سب جج کے تبدیل ہوئے تو انہوں

نے ۱۸۶۲ء میں ایک اور سکول کی بنیاد رکھدی جو اس زمانہ میں وکٹوریہ ہائی سکول کے نام سے مشہور ہے ؛

سائنٹیفک سوسائٹی

سرسید احمد خاں علیہ الرحمتہ انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے لیکن باوجود اس کے نہایت آزادی کے ساتھ انگریزی سوسائٹیوں میں جاتے اور انگریزوں سے ملتے تھے - علوم جدیدہ کی کتابوں کے اُردو تراجم کرواتے اور انہیں اپنے مطالعہ میں رکھتے - یہی وجہ تھی کہ یہ غیر مذاہب کے اصولوں اور اُن کے علوم وفنون سے پوری طرح واقف تھے ؛

۹ جنوری ۱۸۶۴ء میں جب کہ یہ غازی پور میں تھے تو اُنہوں نے The Scientific Society of Aligarh کے نام سے ایک سوسائیٹی کی بنیاد رکھی اور ڈیوک آف آرگیل (Duke of Argyll) اس کے سرپرست مقرر ہوئے اور یہ پہلے انگریز تھے جنہیں ہندوستان کی ایک علمی سوسائیٹی کا سرپرست ہونیکا فخر حاصل ہُوا ؛

باوجود اس حقیقت کے کہ یہ اپنے سرکاری عہدے کے فرائض کے سرانجام دینے میں نہایت منہمک رہتے تھے - عوام کی خدمت کیلئے بھی وقت نکال لیتے تھے اور خدمت کا یہ جذبہ واقعی اس بات کا مستحق ہے کہ موجودہ نسلیں اپنے اس مربّی

اور محسن کا جس قدر بھی شکریہ ادا کریں وہ کم ہے ؛

برٹش ایسوسی ایشن

۱۸۶۴ء میں ان کا تبادلہ علیگڈھ ہو گیا اور اسی سال ستمبر کا مہینہ میں اُنھوں نے ایک پبلک جلسہ میں نہایت زبردست تقریر کی جس میں اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ جلد از جلد ہندوستان کے مطالبات پارلیمنٹ میں پیش کیے جائیں اور دس مئی ۱۸۶۶ء میں ایک اور پبلک جلسہ میں جس میں بہت سے انگریز اور ہندوستانی افسر موجود تھے۔ برٹش ایسوسی ایشن ("British Association") کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور یہ انجمن درحقیقت انڈین نیشنل کانگرس کا بنیادی پتھر تھی ؛

نومبر ۱۸۶۶ء میں لارڈ لارنس (Lord Lawrence,) جو اس زمانے میں ہندوستان کے وائسرائے تھے) نے ایک سنہری تمغہ اور ایک نسخہ لارڈ میکالے کے ادبی شاہکار انکی تعلیمی خدمات کے صلہ میں عطا فرمایا ؛

تمغہ پر ذیل کی عبارت کندہ تھی :-

"Presented by the Viceroy of India, in Public Durbar, to Syed Ahmed, a loyal and valuable servant of the Queen, in recognition of his continuous and successful efforts to spread the light of literature and science among his countrymen.

Agra 20th, November 1866"

سفر انگلستان

۱۸۶۷ء میں سر سید احمدؒ خاں کا تبادلہ بنارس ہوگیا اور اس کے دو سال بعد حکومت ہند نے ان کے صاحبزادہ جسٹس محمود کو حکومت کے خرچ پر انگلستان تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجنا چاہا۔ سر سید احمد خاں باوجود اپنی ان تمام خدمات کے جو انہوں نے ملک و قوم کیلیے سرانجام دیں اس پیرانہ سالی میں جبکہ ان کی عمر باون برس کی تھی اپنے صاحبزادہ محمود کے ساتھ کیمبرج روانہ ہونے کیلیے تیار ہوگئے۔ تاکہ وہ یورپ کی اس بڑی درسگاہ میں جاکر یورپ کی مذہبی تعلیمی اور سیاسی حالت کا مطالعہ کریں مورخہ ۱۰ اپریل ۱۸۶۹ء میں سر سید احمد خاں مع اپنے دو صاحبزادوں سید محمود اور سید حامد کے بمبئی سے انگلستان روانہ ہوگئے وہاں پہنچکر انہوں نے ایک مکان Mackienburg Square W. C. میں کرایہ پر لے لیا۔

انہوں نے انگلستان کے طریقہ تعلیم کا مطالعہ نہایت غور کے ساتھ کیا اور اس امر کا مصمم ارادہ کر لیا کہ ہندوستان پہنچکر وہ اس طریق تعلیم کو مع چند مناسب اضافوں کے جاری کرینگے ؛

انگلستان میں ان کا قیام لارڈ لارنس اور دوسرے انگریز

افسروں کی وجہ سے جو ہندوستان میں ان سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے نہایت خوشگوار بن گیا تھا۔ اور ڈیوک اف آرگیل (Duke of Argyll. نے جو اس زمانہ میں ہندوستان کے سکرٹری آف سٹیٹ تھے سرسید احمد خاں کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور انکا تعارف Marquis of Lorne سے کرایا۔ جنہوں نے ایک تمغہ (Companion of the Star of India) عنایت فرمایا۔ سرسید احمد خاں نے اپنے قیام انگلستان میں ایک سلسلہ خطوط کا شروع کیا جو "علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ" میں شائع ہوتے رہے ایک خط میں انہوں نے بنارس سے بمبئی اور بمبئی سے انگلستان کے سفر کا نقشہ نہایت خوش اسلوبی سے کھینچا ہے۔

اپنے بعض خطوط میں جو انہوں نے اپنے ہندوستانی دوستوں کو لکھے انگلستان کے باشندوں کی حیرت انگیز ترقی کا بیان اس دلاویز پیرایہ میں کیا ہے کہ طبیعت میں خواہ مخواہ اس قسم کی ترقی کے حصول کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

انگلستان سے واپسی

۱۸۷۰ء کے آخر میں سرسید احمد خاں انگلستان سے ہندوستان واپس آگئے اور بنارس میں اپنے عہدہ ججی کا چارج لے لیا سفر انگلستان نے ان کے معلومات میں کافی اضافہ کر دیا تھا اور انہوں نے اس امر کا مصمم ارادہ کر لیا تھا

کہ وُہ تمام مفید اور بہتر اصولوں کو ہندوستان میں رائج کرکے رہینگے اور یہ ایک ایسا ارادہ تھا جس کی راہ میں دنیا کی کوئی طاقت رکاوٹ پیدا نہ کرسکتی تھی ؞

علیگڈھ کالج کی تاسیس

وقت آگیا تھا کہ سرسید احمدؒ خاں اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنائیں جو اُنکی زندگی کا ایک بڑا مقصد تھا۔ یعنی وُہ مسلمان بچوں کیلیے ایک نہایت عظیم الشان درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ اُنکی قوم کے نونہال علوم جدیدہ سے بہرہ ور ہوکر دنیا میں اپنی زندگی کامیابی کے ساتھ بسر کریں۔ اس ارادہ کی تکمیل کیلیے سرسید احمدؒ خاں نے ایک بورڈ بنایا۔ اور جسٹس محمود نے اس بورڈ کے کانسٹی ٹیوشن کو وضع کیا اور ایک چِٹھی کے ذریعہ سے مُلک کے تمام ماہرین تعلیم سے چاہے وُہ کسی جماعت یا فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس کے متعلق استصواب رائے کیا ؞

ملک کے تمام ذی ہوش اور صاحب دانش لوگوں نے سرسید احمدؒ خاں کی سکیم کے ساتھ اتفاق رائے کیا اگر مخالفت کی تو ان لوگوں نے جن کے سر پر پُرانی مذہبیت کا بھوت سوار تھا لیکن ان کی مخالفت سرسید احمدؒ خاں کے عزم آہنیں کے سامنے ایک پرکاہ کی حیثیت نہ رکھتی تھی ؞

بورڈ نے اس بات کو محسوس کیا کہ گورنمنٹ کالج یا دوسرے مشن کالجوں میں مسلمانوں کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ اور وہ کالج مسلمانوں کی ضروریات کے کفیل نہیں ہو سکتے لہذا جہانتک ہو سکے مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت کے احساس کو زندہ کیا جائے اور بہت جلد ایک کالج علیگڈھ میں قائم کر دیا جائے ؂

لیکن احمق اور بے وقوف مسلمانوں نے سر سید احمد خاں کی اس تجویز کی مخالفت نہایت شد و مد کے ساتھ شروع کر دی بلکہ سر سید احمد خاں کو ملحد بے دین اور اس تجویز کالج کو اسلامی اصولوں کی صریح توہین سمجھا بلکہ یہانتک کہ ایک مغلوب الغضب مسلمان نے علمائے مکہ کے نام ایک خط لکھا اور ان سے فتوے طلب کیا کہ وہ ایسے کالج کے حق میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ جس کا بانی۔ بدی کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتا۔ معراج کا منکر ہے۔ آدم و حوا کے قصہ کو نہیں مانتا۔ اور جو یہ کہتا ہے کہ انگریزی پڑھو اور علوم جدیدہ سے فائدہ اٹھاؤ اور مسلمانوں کیلئے ان علوم کی تعلیم دینے کیلئے ایک کالج بنانے پر اصرار کرتا ہے۔ علمائے مکہ نے فتوے دیا کہ ایسے شخص کو اس قسم کا کالج بنانے کیلئے کسی قسم کی کوئی مدد نہ دی جائے جو دے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا ؂

ان فتووں کے علاوہ سر سید احمد خاں کو بہت سے اس

قسم کے خطوط بھی موصول ہوئے جس میں مسلمانوں نے قرآن کی
قسمیں کھا کر انہیں قتل کی دھمکی دی تھی۔ لیکن سر سید احمد خاں
جو خدائے برتر و توانا کی طرف سے اس بات کیلئے مقرر کر دیئے گئے
تھے کہ وہ مسلمانوں کو انکی غفلت سے بیدار کریں اور ان میں
ذوق علم پیدا کر کے معراج ترقی پر پہنچا دیں اپنی تمام زندگی میں
اس قسم کے بد باطن اور شیطان فطرت انسانوں کی شرارتوں
سے محفوظ رہے اور ہمیشہ مسلمانوں کو اشتراک عمل کے لئے
دعوت دیتے رہے۔ اُنہوں نے تمام ملک کا دورہ کیا چندہ جمع
کیا اور علیگڈھ کالج کی بنیاد رکھنے کی تیاری شروع کر دی۔
ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام دکن نے اپنی موروثی فیاضی سے
کام لیکر کالج کیلئے نو لاکھ روپیہ کی رقم خطیر عطا کی۔ اور مہاراجہ
پٹیالہ نے باوجود غیر مسلم ہونیکے اٹھاون ہزار روپیہ عطا کیا
مورخہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو ہز اکسیلینسی دی رائٹ آنریبل ایڈورڈ
رابرٹ لٹن جی۔ ایم۔ ایس۔ آئی گورنر جنرل آف انڈیا نے ایم اے
او۔ کالج علیگڈھ کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم ادا کی ؀
سر سید احمد خاں علیہ الرحمتہ ۱۸۷۶ء اپنے عہدہ ججی سے
ریٹائر ہوگئے اور کالج کی خبر گیری کیلئے علیگڈھ ہی میں قیام
کیا انہیں کالج کیلئے مسلمان طلباء کے مہیا کرنے میں ایک ایک
قدم پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن باوجود اس تمام مخالفت
کے کالج کے آغاز میں پچاس طلباء مل گئے اُس زمانہ میں صرف
دو بورڈنگ ہاؤس تھے۔ سر سید احمد خاں طلبا کے چال چلن

کی سخت نگرانی کرتے تھے ؛

۱۸۷۸ء میں ایف۔اے کلاسنز اور ۱۸۸۱ء میں بی۔اے اور ایم۔اے کلاسنز کھولدی گئیں سب سے پہلے کالج کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ ملحق تھا اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ اور اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ ؛

لارڈ لٹن پر (وائسرائے ہند) سر سید احمد خاں کے علم ولیاقت اور شخصیت کا خاص اثر ہُوا۔ اور ۱۸۷۸ء میں انہیں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور وہ اس عہدہ پر پانچ سال تک متمکن رہے۔ اور کونسل میں انکی تقریر ہمیشہ اُردو زبان میں ہوا کرتی تھی ؛

۱۸۸۴ء میں اُنہوں نے پنجاب کا دورہ کیا اور ہندو مسلمانوں نے مشترکہ طور پر ہر جگہ ان کا خیر مقدم کیا اور ایڈریس پیش کئے

لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) نے انہیں پنجاب سروس کمیشن کا ممبر منتخب کیا اور اُنہوں نے اس سلسلہ میں ملک کی بہترین خدمات سرانجام دیں ؛

۱۸۸۹ء میں انہیں حکومت کی طرف سے کے۔سی۔ایس آئی کا خطاب ملا ؛

سر سید احمد خاں تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ لیکن وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ ہندوستانی لڑکیاں انگریزی رنگ میں رنگی جائیں ؛

سر سید احمد علیہ الرحمتہ کی زبردست شخصیت ہندوستان کیلئے بالعموم اور مسلمانوں کیلئے بالخصوص مایہ صد افتخار ہے اُنہوں نے ہندوستان میں سے جہالت کی تاریکی کو علم کی نورانی شعاعوں کے ذریعہ سے دور کیا اور سوسائٹی کو جو پستی کے عمیق غار میں گری پڑی تھی نکال کر ترقی اور عزت کی بلند چوٹی پر پہنچا دیا وُہ شریف محبِ وطن تھے اللہ تعالےٰ نے اُنہیں ذہنی اور دماغی طاقتوں کا معتد بہ حصہ عطا کیا تھا وُہ ایک عالی اور شریف خاندان کے فرزند تھے جنہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے اپنے آپ کو ابدی شہرت کا حقدار ثابت کیا۔ ان کا انتقال ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہُوا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ کالج کی مسجد میں دفن کئے گئے۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انکی روح کو ابدی و غیر فانی راحت اور سکون عطا کرے۔ آمین

ملک محمد عنایت اللہ پروفیسر

مشن کالج لاہور

۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۱ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انتخاب مضامین سرسید

۱۔ تعلیم

تعلیم سے ہماری مراد موافق عرف[1] عام کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے۔ ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد[2] سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں ؛

عام مقاصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے خواہ تعلیم پانیوالے خود اس پر متوجہ ہوں یا اطفال[3] کے مربیوں[4] نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو یہ ہے کہ اُنکے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوئی ہو۔ زندگی کے کاروبار میں اس کیلئے نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہے۔ ان تعلیم پانیوالوں میں لاکھوں آدمی تو ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ادنے درجہ تعلیم تک پہنچکر اور کچھ متوسط[5] درجہ کی تعلیم تک

---

[1] عرف عام سے مراد۔ عام خیالات کے مطابق یا جس طرح عام لوگوں میں مشہور ہے ؛
[2] مقاصد جمع مقصد۔ اغراض۔ مطالب ؛ [3] اطفال جمع طفل مراد لڑکے ؛
[4] مربیوں جمع مربی بمعنے سرپرست ؛ [5] درمیانی درجہ ؛

پہنچکر رہ جاتے ہیں۔ اور چند ایسے ہوتے ہیں۔ کہ متوسط درجہ کی تعلیم
سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں سے کسی
شاخ کی تکمیل[1] پر مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بننا چاہتا ہے کوئی ادیب[2]
کوئی فلسفہ[3] میں ترقی کرتا ہے اور کوئی ریاضیات[4] میں۔ اور کوئی دینیات[5]
میں وعلیٰ ہذا القیاس۔ مگر ہر ایک کے ساتھ حصول معاش کا خیال
لگا رہتا ہے اور جو کچھ وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کو ذریعہ
حصول معاش[6] ضرور سمجھتا ہے۔

تعلیم بغیر اس کے کہ اس کے حاصل کرنے کیلئے کوئی زبان اختیار
کی جاوے غیر ممکن ہے۔ جس زمانہ میں جس زبان کا عروج[7] ہوتا ہے
وہی زبان اس کیلئے اختیار کی جاتی ہے۔ یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے کہ
جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے اسی زبان کا عروج ہوتا ہے
خلفائے بنی اُمیہ[8] اور بنی عباس[9] کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا
ہر شخص اسی زبان میں علوم کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانہ میں
ہندوستان میں سنسکرت زبان کا عروج تھا اسی کو لوگ اختیار کرتے تھے جب

---

[1] مکمل کرنا۔ انتہا تک پہنچانا ؛ [2] ماہر لٹریچر ؛ [3] موجودات کا علم۔ علم حکمت ؛
[4] ریاضی حکمت کے تین علوم میں سے ایک علم کا نام ہے جس میں اُن امور کی بحث
ہوتی ہے جو وجود خارجی میں مادہ کے محتاج ہوں۔ جیسے مقدار اور عدد و خاص اس علم کے اقسام
یہ ہیں۔ ہندسہ۔ حساب۔ نجوم۔ موسیقی۔ جبر و مقابلہ۔ جر اثقال ؛ [5] مذہبی اور دینی علم ؛
[6] زندگی کی گذران وہ حالت جسمیں آدمی رہتا ہے ؛ [7] ترقی ؛ [8] عرب کا مشہور حکمران
خاندان جس کا پایۂ تخت دمشق تھا ؛ [9] مشہور اسلامی حکمران خاندان جس کا پایۂ تخت بغداد تھا ؛

مُسلمانوں کی عملداری[1] ہندوستان میں ہوئی تو فارسی زبان کا عروج ہُوا اَور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اب ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے جس کی زبان انگریزی ہے اور اسی زبان کو عروج ہے۔ اس لئے ہر شخص اسی زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے۔ ہاں مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کچھ کوتاہی کی۔ اس کے کچھ ہی سبب ہوں مگر اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ کہ وُہ اپنی غلطی سے انگریزی زبان پڑھنے کو مخالف مذہب اسلام سمجھتے تھے۔ مگر جب سے یہ خیال کم ہوگیا یا دنیوی ضرورت نے انہیں مجبور کیا۔ اسی وقت سے مسلمانوں نے بھی انگریزی زبان میں تعلیم اختیار کرنا شروع کر دی ہے مگر بہت سے مسلمان مذہب کو دنیوی ضرورت سے مقدم[2] سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ انہیں یہ خیال کہ انگریزی پڑھنی مذہب اسلام کے برخلاف ہے کم ہوگیا ہے۔

اکثر حکام اور نیز بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ لوگ صرف سرکاری نوکری حاصل کرنے کو انگریزی پڑھتے ہیں۔ مگر غور کرنے کی بات ہے۔ کہ ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے سینکڑوں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگری پاتے ہیں۔ اور انکو یقین کامل ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کے پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں۔ کہ وُہ اس جمِّ غفیر[3] بی۔ اے اور ایم۔ اے ڈگری یافتوں کو دے سکے پس یقینی ڈگری یافتہ طالبعلموں کو اس کا یقین ہوتا ہے۔ کہ سب کو سرکاری

---

[1] حکومت ۔ [2] مراد۔ دنیوی اغراض پر ترجیح دیتے ہیں۔ [3] مراد۔ تعداد کثیر۔

نوکری نہیں مل سکتی۔ باوصف اس یقین کے جو وہ انگریزی پڑھنے پر مشغول ہیں۔ تو ضرور ہے کہ سوائے ملازمت سرکاری کے اور کسی ذریعہ سے بھی ان کو معاش حاصل کرنے کا خیال ہے۔ یا اس بات کا یقین ہے۔ کہ انگریزی پڑھا ہُوا بن انگریزی پڑھے ہوئے سے دنیوی کاروبار کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ بہرحال یہ بات غلط ہے۔ کہ ہر ایک بی۔ اے اور ایم۔ اے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے پڑھتا ہے۔ اور نہ ملنے کے سبب سرکار سے ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کو پہلے سے یقین ہے۔ کہ سرکار سب کو نوکری نہیں دے سکتی۔ ہاں جب موقع ہوتا ہے۔ تو ہر ایک سرکاری ملازمت ملنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کو ضرور کرنی چاہیئے۔

اس زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے۔ اور اگلے زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی۔ یہ فرق ہے۔ کہ اگلے زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیا تھا کہ ہر شخص جو علم کی کسی شاخ میں یا شاخوں میں اس زمانہ کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا اور اس فن کا ماسٹر ہونا چاہتا تو ہو سکتا تھا۔ اور سوسائٹی جو اُس زمانہ میں موجود تھی۔ اس تعلیم کی مدد کرتی تھی اور اس پر عمدہ اخلاقی[1] اثر ڈال کر اس کو اس سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق[1] و حسن معاشرت[2] کے ایسی عمدہ تھی

---

[1] جمع خُلق بمعنے خو۔ عادت۔ خوش مزاجی۔

[2] عمدگی۔ خوبی او بھلائی کے ساتھ زندگی بسر کرنا اور رہنا سہنا۔

کہ اس میں کوئی نقص اس زمانہ میں بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ مگر افسوس ہے۔ کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وُہ قائم نہ رہی؛

اس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلےٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے۔ تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی وُہ یونیورسٹیاں ہیں۔ جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وُہ بلاشبہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس تعلیم کو اعلےٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب[۲] ہے بلکہ وُہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط[۳] درجہ کی تعلیم ہے۔ اور بعض شاخوں میں ادنیٰ[۴] درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے؛

بالفعل جو باتباع[۵] احکام یونیورسٹیوں کے اس کے ماتحت کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ وُہ زیادہ تر کتابی اور دماغی[۶] تعلیم سے متعلق ہے اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ ضرور یہی ہونا چاہیے جو مسٹر کرول نے اپنے لیکچر میں بیان کیا ہے۔ اور جس کو اودھ اخبار نے اُردو زبان میں لکھا ہے۔

---

[۱] حکومت کا مقصد موجودہ طریقہ تعلیم سے ہندوستان میں بہترین دماغ پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ سلطنت کی کل کے چلانے کیلئے چند پرزے ڈھالنا ہے جو مختلف دفاتر میں کلرکی کا کام کریں؛ [۲] غیر مناسب؛ [۳] درمیانی درجہ کی؛ [۴] کم درجہ کی؛ [۵] پیروی کرنا۔ متابعت کرنا؛

[۶] کتابی اور دماغی تعلیم سے مراد موجودہ تعلیم ہے جسکا تعلق صرف کتاب اور قوت حافظہ تک محدود ہے۔ تعلیم کا مقصد اعلےٰ اس تعلیم سے پورا نہیں ہوتا۔ اور طلبا میں کسی قسم کی خاص قابلیت پیدا ہوتی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ کالجوں میں سے اعلےٰ دماغی اور ذہنی قابلیتوں کے طلباء کم نکلتے ہیں؛

اُنہوں نے فرمایا "کہ تعلیم کا منشا یہ نہیں ہے۔ کہ چند آدمیوں کی دولت بڑھ جائے یا آئندہ غربا کے مقابلہ میں باقیماندہ اشخاص کی زیادہ رعایت کی جائے۔ اور نہ تعلیم کا منشا یہ ہے۔ کہ اس کے ذریعہ سے لوگ صرف اپنی باہمی محافظت کریں۔ یا سوداگری اور تجارت ہی کو ترقی دیں۔ بلکہ تعلیم کی خاص غایت[1] اور اصل منشاء یہ ہے۔ کہ لوگ نیک محض اور عمدہ قسم کے باشندے ہو جاویں اور وہ عزت حاصل کریں جو زندگی کے بے داغ رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور لوگوں کے سوشیل اور اخلاقی خصائل[2] کی تکمیل کرلیں۔ اور ان بھاری اور عمدہ کاموں کا حوصلہ دلائیں جن سے ملک کی عزت اور زینت ہوتی ہے "

سر ولیم میکورتھ ینگ نے جو ڈگری یافتہ طالبعلموں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اس کا حاصل بھی وہی ہے جو مسٹر کرول نے اپنے لیکچر میں کہا تھا۔ سر ولیم میکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالبعلموں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کی ڈگریاں اس بات کے لئے ہیں۔ کہ وہ اپنے روزمرہ معاملات اور گفتگو میں معزز برتاؤ[3] اختیار کریں اخلاق[4] اور عمدہ تعلیم کی ترقی میں مدد دیں۔ سوشیل نظام اور اپنے ہمجنسوں کی بہبودی کے قائم

---

[1] انجام۔ غرض۔ مطلب۔ انتہا ۔ [2] جمع خصلت کی ۔

[3] معزز برتاؤ سے مراد یہ ہے کہ وہ بلحاظ معاملات اور گفتگو کے اپنے آپکو مہذب ثابت کریں۔ اُنکی گفتگو نہایت پاکیزہ اور شستہ ہو اور معاملات میں اُنکا طریق عمل احسن اور قابل تعریف ہو ۔ [4] اور اچھے اخلاق دوسرے لوگوں میں پیدا کر نیکی کوشش کریں اور اعلےٰ درجہ کی تعلیم کے پھیلانے میں پوری سعی کو کام میں لائیں اور ہمیشہ دوسرے انسانوں کی فلاح اور بہبود کا خیال رکھیں ۔

رکھنے میں کوشاں رہیں۔ المختصر ایک بھاری سلطنت کے بر آور دہ شہریوں کے فرائض ادا کرتے رہیں ؛

مگر ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی ۔ بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔ ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی[1] علماء اور نیک خدا پرست رحمدل۔ نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی وہ مدت ہوئی کہ مردہ ہوگئی ہے۔ اور نئی سوسائٹی جو زمانہ حال کے موافق ہو۔ اب تک قائم نہیں ہوئی یا مکمل نہیں ہوئی۔ اسلئے وہ نتائج[2] جن کا ذکر مسٹر گرول نے اپنے لیکچر میں کیا۔ یا سر ولیم میکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالبعلموں سے خواہش کی حاصل نہیں ہوتی ؛

ہم اس بات کو جیسا کہ اودھ اخبار نے لکھا ہے۔ نہایت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اسکول ماسٹروں کو چاہئے کہ اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کرتے رہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کا چلن اور شریفانہ اولوالعزمیاں اختیار کریں۔ اور اسی طرح ہمارے کالجوں کے پروفیسروں کو بھی منجملہ ایسے لوگوں کے ہونا چاہیئے۔ جن میں خیالات[3] عالیہ پائے جاتے ہوں" مگر ہماری رائے میں جبتک کہ خود اسی قسم کے چند لوگ اس قسم کی سوسائٹی۔ کے مہذب کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور دلی سعی و کوشش نہ کریں۔ سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب کہ باوجودیکہ کئی

---

[1] قدیم سوسائٹی سے مراد وہ لوگ ہیں جو برطانوی حکومت کے تسلط سے پہلے ہندوستان میں موجود تھے اور بلحاظ اپنی ذاتی شرافت اور خدا پرستی کے موجودہ دور کے انسانوں پر فوقیت رکھتے تھے ؛ [2] جمع نتیجہ ؛ [3] بلند خیالات ؛

قرن[1] گورنمنٹ کو ہندوستانیوں کو تعلیم دیتے ہوئے گذرے - مگر انکی
سوسائٹی کی حالت اب تک درست نہیں ہوئی ؛
نہایت مشکل یہ ہے - کہ دنیا میں کسی قوم کی سوسائٹی اور سوشیل حالت
ایسی نہیں ہے - کہ جس میں ایسے امور[2] بھی شامل نہ ہوں جنکی بنا غلط یا
صحیح طور پر مذہبی امور پر مبنی[3] ہوئی نہ کہی جاتی ہو - پس اگر وہ امور ترقی
سوسائٹی کے مانع[4] ہیں - اور غلطی سے انکی بنا مذہبی امور پر کی جاتی ہے
تو جبتک اسی قوم کا کوئی شخص اس غلطی کو ظاہر نہ کرے اور اس مانع کے
رفع کرنے میں کوشش نہ کرے تو وہ رفع[5] نہیں ہو سکتی - غیر قوم کے شخص کا
اس امر مانع پر متنبہ[6] کرنا گو وہ کیسا ہی سچ کہتا ہو مخالف اثر پیدا کرتا ہے -
اور خیال ہوتا ہے کہ وہ شخص بسبب اختلاف قومی یا مخالفت مذہب کے
ایسا کہتا ہے - اگرچہ ہمقوم اور ہم مذہب والے پر بھی ہزاروں شخص طرح
طرح کے اتہام لگاتے ہیں اور اس کی بات کی سماعت[7] نہ ہونے پر کوشش
کرتے ہیں - اور گورنمنٹ تو ایسی کوئی بات جس سے مذہب میں مداخلت
کرنے کا شبہ بھی ہو اختیار نہیں کر سکتی - غرضیکہ اخلاقی اور شریف النفسی
کی تعلیم عمدہ سوسائٹی پر منحصر ہے - اور انگریزی گورنمنٹ سوائے تعلیم دینے
کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کر سکتی جس سے ہندوستانیوں میں
سوسائٹی کی حالت اچھی ہو - اور عمدہ سوسائٹی ان کی بن جاوے ؛

---

[1] مدت دراز جو ۳۰ یا ۸۰ یا ۱۰۰ سال تک فرض کی گئی ہے ؛ [2] جمع امر ؛
[3] بنا کیا ہوا - بنایا ہوا ؛ [4] رکاوٹ ؛ [5] دور نہیں ہو سکتی ؛ [6] واقف
کرنا - خبردار کرنا ؛ [7] نہ سننے جانے کے لئے ؛

دماغی تعلیم جس کا ہم نے ابھی اُوپر ذکر کیا کچھ شبہ نہیں ہے کہ انسان کو انسان اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اُسکے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت کچھ مدد کرتی ہے۔ مگر جب مسئلہ حصولِ معاش پر نظر کی جاتی ہے۔ تو لوگ کہتے ہیں۔ کہ یقینی امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصولِ معاش کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں ہے۔ اور اسلئے ان کو اور نیز ہمارے حکام کا اس طرف خیال کیا جاتا ہے کہ حرفت اور فن کی تعلیم جسے سائنس اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے زیادہ وسعت دیجاوے۔ ٹیکنیکل[1] ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے کہ اس سے کیا مراد ہے ؟ اگر اس کی مراد حرفتوں کی تعلیم سے ہے۔ جیسے لوہاری۔ بخاری نوربافی وغیرہ وغیرہ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستانیوں میں بہت کم پاتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہندوستان میں نہیں ہے۔ اگر یورپ کو یا اور کسی ملک کو اس بات میں کچھ تفوق ہے تو وہ صرف اس وجہ سے ہے۔ کہ جو کام ہندوستان میں ہاتھوں سے ہوتا ہے وہ ان ملکوں میں کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں قائم کرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں۔ جو ان میں کام کرتے ہیں۔ بلکہ کلوں کے قائم کرنے والی ایک جدا جماعت ہے ہندوستان میں اگرچہ کہیں کہیں ایسی جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مگر ہندوستان میں عام طور پر ایسی جماعتوں کا قائم ہونا ظاہرا بہت دُور اور

---

[1] اس انگریزی لفظ کا ترجمہ اُردو میں۔ دستکاری۔ صنعت وحرفت کی تعلیم ہو سکتا ہے۔ مثلاً بخاری۔ آہنگری۔ بافندگی۔ رنگسازی۔ صابون گری۔ موٹر کا کام۔ شیشے کا کام دیا سلائی بنانا۔ اور ایسے ہی اور کام ٹیکنیکل تعلیم کے تحت میں آئینگے۔ مؤلف تفصیلات۔ برتمدی

بعض وجوہ سے اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو ضرور معلوم ہوتا ہے ؛

سائنس[1] بلا شبہ نہایت عمدہ چیز ہے۔ اور سائنس کے جاننے والا آج کل کے زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت[2] پر پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اور معاش حاصل کرنے کیلئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اس کے پاس ہوتا ہے جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ مگر یورپ کے ملکوں کا قیاس[3] ہندوستان پر نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں ہر قسم کے متعدد[4] کارخانے موجود ہیں۔ اور اسلیئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں سائینس کی تعلیم دینا فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہر قسم کے سائینس جاننے والے کیلیئے ہر قسم کے کارخانے موجود ہیں جن میں وہ جا سکتا ہے اور اپنی معاش پیدا کر سکتا ہے مگر ہندوستان میں اس قسم کے کارخانے نہیں ہیں اور نہ ابھی انکے ہونیکی توقع ہے پس سائینس جاننے والا بجز اس کے کہ سائینس کا عالم ہو کر اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور کوئی ذریعہ معاش کا حاصل نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ ڈاکٹری۔ انجنیری نقشہ نویسی وغیرہ کی جو ٹیکنیکل ایجوکیشن یا سائینس میں داخل ہیں۔ بقدر ضرورت اس ملک کے تعلیم دیتی ہے۔ اور اس ذریعہ سے وہ لوگ معاش بھی پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ تعلیم کی نہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں گنجائش ہے۔ اور نہ وہ اس تعلیم سے کچھ معاش پیدا کر سکتے ہیں ؛

بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور سوشیل حالت کی درستی کی ہے۔ جو ابھی تک نہیں ہوئی۔ یا پورے طور

---

[1] علوم حکیمہ ؛ [2] کسب۔ پیشہ۔ ہنر ؛ [3] اندازہ کرنا۔ اور اصطلاح علم منطق میں ایک قول ہے مرکب دو جملوں سے جس سے نتیجہ نکلے اُسکو اصطلاح منطق میں شکل بھی کہتے ہیں ؛ [4] بکثرت ؛

پر نہیں ہوئی تھا اس کے بعد باقی امور لحاظ کے قابل ہیں۔ پس ہم کو مناسب نہیں ہے۔ کہ ہم دفعتہً سب امور کا ہونا چاہیں۔ بلکہ جو کام ہم کو پہلے کرنا ہے۔ اس کو مقدم سمجھیں۔ اور اس کے بعد جو کام کرنے ہیں کریں ؛

۲۔ تعصّبؔ[1]

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے یہ ایسی بدخصلت ہے۔ کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اسکی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے۔ مگر اسکا طریقہ بات جتلاتا ہے۔ کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی ہے ہے۔ اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کا تعصب اس کے خلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے۔ تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا ؛

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا۔ اور دیدہ دانستہ

---

[1] مذہبی حمایت۔ مذہبی رعایت، دشمنی۔ یہ لفظ عام طور پر مذہب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مگر اسکے علاوہ قومی تعصب اور دوسرے موقعوں پر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ متعصب تعصب کرنیوالا۔ دشمنی رکھنے والا

برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے ؛

مذہبی تعصبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کرینگے۔ مگر اوّل امور تمدن[1] و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں اُن کا ذکر کرتے ہیں ؛

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہُوا ہے۔ وُہ تنہا اپنی حوائج[2] ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں[3] اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف[5] اور بیزار رہتا ہے اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں مائل[6] نہیں ہوتا ؛

عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا[7] یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت[8] اور زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں۔ ان کو انسان اختیار کرے۔ مگر متعصب ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے ؛

ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں۔ کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہئے۔ مگر متعصب اپنی بد خصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے ؛ وُہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم

---

[1] وُہ امور جو شہری زندگی میں لازمی ہیں اور جو مختلف انسانوں کی ضرورتوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کریں ؛ [2] ایک دوسرے کیساتھ تعلقات رکھنے کیلئے مجبور ہے ؛ [3] حاجتوں۔ ضروریات ؛
[4] مددگاروں ؛ [5] برگشتہ۔ بدلنے والا۔ پھر جانیوالا۔ اُلٹ پلٹ۔ خم کھانے والا ؛
[6] رغبت رکھنے والا۔ شائق۔ متوجہ ؛ [7] تقاضا۔ (demand) [8] نفع دینے والی۔ مفید ؛

اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہنا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے۔ اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اسمیں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا ٭

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل[۱] و دانش[۲] میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں کیا جاہ و حشمت[۳] اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجہ ذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں۔ اور بہت سی قومیں ہیں جنہوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں۔ اور ادنے[۴] درجہ سے ترقی کے اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ پر پہنچ گئیں ٭

مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں۔ اور اسی سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم دکھلانے سے محروم۔ اور ذلت اور خواری اور بےعلمی اور بےہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور اسی لئے میری خواہش ہے کہ وہ اس خصلت سے نکلیں۔ اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں ٭

---

۱ فضیلت ۔ برتری ۔ بزرگی ٭ ۲ عقل ۔ سمجھ ٭ ۳ منصب ۔ دبدبہ بزرگی ٭ ۴ ادنےٰ ٭ ۵ حاصل کیں ٭

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ پڑی ہے۔ کہ بعض دفعہ ایک غلط نمائی کے جذبہ سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو۔ اور تمام شخصوں کو جو اس مذہب کے نہیں ہیں اور تمام ان علوم اور فنون کو جو اس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں۔ نہایت حقارت[1] سے دیکھے۔ اور بُرا سمجھے۔ اس شخص کو نہائت قابل تعریف اور توصیف[2] کے اور بڑا پختہ اور پکا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے[3]۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ[4] چیزیں ہیں بس بڑی نادانی ہے۔ جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے۔ کیونکہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں۔ تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے۔ کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم[5] سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں۔ کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ[6] منہا۔

---

[1] نفرت۔ ذلت۔ [2] وصف خوبی۔ [3] اس زمانہ میں بھی جبکہ دنیا کا ذرہ ذرہ بیدار ہو چکا ہے، بدقسمتی سے مسلمانوں میں اس قسم کے غلط کار مذہبی لیڈر موجود ہیں جو غلط مذہبی اصولوں کی بناء پر مسلمانوں کی دنیوی ترقی میں روڑے اٹکاتے ہیں سر سید موحوم کے زمانہ میں بھی اسی قسم کے غلط کار علماء نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی جسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمان بلحاظ تعلیم کے اپنی دوسری ہمسا قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ مسلمانوں کی یہ تعلیمی پستی محض بعض عاقبت نااندیش علماء کے تعصب کی رہین احسان ہے۔ [5] مضبوط۔ [6] پناہ مانگتے ہیں ہم خدا کی۔ عام طور پر یہ کلمہ اظہار نفرت کیلئے بولا جاتا ہے۔

مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم میں ترقی ہوتی جاوےگی۔ اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں۔ کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے۔ جو کسی اہل مذہب کیلئے ہو سکتی ہے اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو نہایت برا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے۔ اس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے۔ مخالفوں اور معترضوں[1] اور برا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے۔ اور خود بھی اس کے دفعیہ کو مستعد[2] ہوتا ہے اور لوگوں کو اس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلی بسم اللہ ایسی بدخصلت اختیار کرتی جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے بدلے الٹا اس کا مانع[3] قوی ہوتا ہے۔ اپنے تعصب کے سبب بد اخلاقی

---

[1] اعتراض کرنیوالوں۔ [2] تیار ہوتا ہے۔ [3] ایک زبردست رکاوٹ بنتا ہے یعنی ایک متعصب شخص اپنے طرز عمل سے اپنے مذہب کی خود ہتک کرتا ہے اور ایسے شخص کی عادتوں کو دیکھ کر ہر شخص اس کے مذہب کے متعلق نہایت برے خیالات قائم کر لیتا ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ متعصب شخص کے مذہب کے متعلق قسم قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اور مغرور اور بد مزاج اور سخت دل ہو جاتا ہے اور ٹھیک ٹھیک اس آیت کریمہ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ سے مخالفت صریح ہے ؂

مذہب میں متعصب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور اس سبب سے ضمناً وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے۔ کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کئے اور بلا جواب دیئے باقی رہ جاویں۔ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتا ہے۔ کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے۔ پس یہ تمام باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں ہیں۔ بلکہ مخالفوں کی فتحیابی اور میدان جیت لینے کی ہیں ؂

غرض کہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں نہایت بڑا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے ؂

مغرور و متکبر ہو جانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے ؂

اس کے اصول کا مقتضا یہ ہوتا ہے۔ کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو۔ مگر ایسا کر نہیں سکتا اور مجبوری ہر ایک سے

؎ اے محمدؐ اگر تم سخت مزاج اور سخت دل ہو جاتے تو لوگ تمہارے ارد گرد سے بھاگ جاتے ؂ ؎ صاف واضح ؂ ؎ بلا کھوج لگائے۔ بلا دریافت کئے ؂ ؎ گوشہ نشین ہو جائے الگ ہو جائے ؂

ملتا ہے۔ اور اوپر کے دل سے ان کا ادب اور اپنی جھوٹی نیاز مندی[1] بھی ظاہر کرتا ہے۔ اور ایسا کرنے سے ایک اور بد خصلت نفاق[2] اور کذب[3] اور دغا بازی اور فریب و مکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے ؛

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں۔ بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بد نصیب رہتا ہے ؛

علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اسکو دستگاہ[4] نہیں ہوتی دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصول معاش اور دنیاوی عزت اور تمول[5] مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل اور خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے ؛

اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا۔ کہ اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں۔ بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے۔ پیا کیا بن رہا ہے! دہ لکھی کیا چن رہی ہے وہ بجز کوڑے بھر کی گھانس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ باغ کیوں بنا ہے۔ اور پھول کیوں کھلا ہے۔ نرگس کیا دیکھتی ہے۔ اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے ؛

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جبتک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال اس میں نہیں آتا تربیت[6] و شائستگی[7] تہذیب و انسانیت کا مطلق

---

[1] محتاجی۔ حاجتمندی ؛ [2] کینہ۔ دشمنی ؛ [3] جھوٹ ؛ [4] دسترس ؛ [5] دولت مندی۔ امارت ؛ [6] تعلیم۔ اخلاق۔ پرورش ؛ [7] تہذیب۔ لیاقت ؛

نشان نہیں پایا جاتا۔ اور جبکہ وُہ مذہبی غلط نمائی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سمِ[1] قاتل ہوتا ہے۔ کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب و برباد کرنے کیلئے شیطان کا سب سے بڑا داؤ تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھلاتا ہے ؛

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے۔ کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا۔ سچائی کو پسند کرنے والا ہے وُہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وُہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہیئے تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم پیروی کرنا چاہیئے ؛

۳۔ تکمیل[2]

ایک فارسی مثل مشہور ہے۔ کہ ہر کمالے را زوالے[3] مگر اسکے معنی اور اس کی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک اور بڑے حکیم[4] نے اسی مطلب کو نہایت عمدگی اور وضاحت[5] سے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ قول ہے۔ کہ ہم کو اپنے تئیں درجۂ کمال پر پہنچا ہُوا سمجھنا ہی زوال کی نشانی ہے !!

---

[1] زہر قاتل ؛ [2] کامل کرنا۔ انجام کو پہنچانا ؛ [3] ہر کمال کیلئے زوال ہے ؛ [4] دانا۔ عقلمند ؛
[5] صاف طور پر ؛

اور بلا شبہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسلیے کہ جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے۔ تو اسمیں سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کے ایجاد سے باز رہتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس چیز میں جس کو کامل سمجھا تھا زوال آجاتا ہے ؛

کامل مطلق بجز ذات[1] باری کے اور کوئی نہیں ہے۔ پس جو کچھ کہ خدا نے کیا یا کہا وُہ تو اپنی قسم میں کامل ہے۔ اور اسکے سوا اور کوئی چیز جو انسان کی ہو اور کہی ہو کامل نہیں ہے۔ کیونکہ قابل سہو[2] خطا ہونا انسان کی شان سے ہے۔ اگر یہ بات اس طرح پر نہ ہوتی۔ تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہونیکی ضرورت نہ رہتی۔ پس ان تمام چیزوں کو جو انسان سے ایجاد ہوئی ہیں یا نتائج عقل انسانی ہیں۔ ان کو کامل سمجھ لینا ہماری بڑی غلطی اور ہمارے تنزل[3] ادبار کی ٹھیک نشانی ہے ؛

کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانوں کا باعث ہوتا ہے۔ جو کچھ کہ حقیقت میں کامل نہیں ہے۔ ہم اس کو غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں ؛

ہم میں ایک استغنا[4] پیدا ہوتا ہے جس سے سوائے اس کے اور کسی بات یا تحقیقات کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اور اس بات کے فائدے سے محروم رہتے ہیں ؛

لوگوں کے اعتراضوں کے سننے کو گوارا نہیں کرتے اور اس

---

[1] حق تعالیٰ۔ خدائے بزرگ و برتر ؛ [2] غلطی۔ بھول چوک ؛ [3] زوال۔ تخفیف۔ بد اقبالی۔ نحوست ؛ [4] بے پرواہی۔ غنی پن ؛

سبب سے اپنی غلطیوں پر متنبہ نہیں ہوتے اور جہل مرکب[1] میں پھنسے رہتے ہیں۔ کوشش سے جو ایک ترقی کا فائدہ ہے اس کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں ٭

خدا نے جو ہم کو عقل دی ہے اور جس کا یہ فائدہ ہے۔ کہ جہاں تک ہو سکے ہم اس کو کام میں لاویں اوروں پر بھروسہ کر کر اس کو بیکار کر دیتے ہیں ٭

ایسا کرنے سے ہم صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتے۔ بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی بہت بڑا نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کی عقل اور جودت طبع[2] اور تیزی ذہن اور طاقت انتقال ذہنی[3] اور قوت ایجاد[4] سب مٹ جاتی ہے۔ اور صرف اوروں کی ٹٹکاری[5] پر ہماری چال رہ جاتی ہے۔ اور ہم ٹھیک اس مثل کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ "چار پائے بر و کتابے چند"

ہم مسلمانوں نے اپنے میں اس نقص کو نہایت درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ اور جو نقصان دینی اور دنیوی اس سے ہم نے اٹھائے ہیں۔ ان کی کچھ انتہا نہیں۔ بھلا دینی باتوں کو اسوقت رہنے دو۔ اور صرف اس بات پر غور کرو کہ دنیوی علوم[6] اور دنیوی کاروبار اور دنیا کی باہمی

---

[1] ایسی جہالت جو دفع نہ ہو سکے اور جو لاعلاج ہو ٭ [2] تیز فہمی ٭ [3] وہ قوت جو ذہنی طاقت کو مختلف امور کی طرف منتقل کرتی ہے ٭ [4] وہ طاقت جس کے ذریعے سے انسان مختلف اشیاء ایجاد کرتا ہے ٭ [5] وہ آواز جو انسان کسی جانور کو ہانکنے کیلئے زبان کو تالو سے لگا کر نکالتا ہے ٭ [6] وہ علم جسکا تعلق دنیا سے ہو ٭ [7] دنیا میں میل جول صحبت مجلس

معاشرت اور مجالست اور رسوم و عادات اور طریقہ تعلیم اور تربیت اور ترقی علم مجلس میں کیوں ہم نہ کوشش کریں۔ اور جس طرح اور قوموں نے ان باتوں میں ترقی کی ہے ہم بھی اسی طرح کیوں نہ ترقی کریں ٭

ارسطو[1] کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے علوم اور اس کے فلسفہ اور اس کے الہیات[2] کو نا قابل غلطی کے سمجھیں۔ بوعلی[3] کچھ صاحب وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں۔ جو علوم دینوی مدت دراز سے پڑھتے آتے تھے۔ اور جو اپنے زمانہ میں ایسے تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ انہی پر پابند رہنے کے لئے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالیٰ کی عجائب قدرت کے نمونے ہیں۔ اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں ان کو کیوں نہ دیکھیں ٭

یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے۔ یہ صرف خیالی ہی باتیں نہیں ہیں بلکہ اس وقت دنیا میں ہمارے سامنے اس کی مثالیں بھی موجود ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں۔ جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجہ کمال پر پہنچا ہُوا اور ناقابل سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون اور طریق معاشرت کو کامل سمجھا اور اس کی پیروی کرتے رہے۔ اور اس کی ترقی اور بہتری پر اور نئی نئی

---

[1] سلطان سکندر کا وزیر اور یونان کا مشہور فلاسفر ٭ [2] وہ علوم جن کا تعلق ذات باری سے ہو ٭
[3] حکیم بوعلی سینا مشہور طبیب و حکیم ٭

چیزوں کے اخذ و ایجاد[1] پر کچھ کوشش نہیں کی - اور دوسری نے کسی کو کامل نہیں سمجھا - اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے نئے علوم و فنون و طریقہ معاشرت کے ایجاد میں کوشش کرتی رہی - اب دیکھو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے - اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے ٭

ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں جو پچھلی لکیر[2] کو کامل سمجھ کر اسی کو پیٹتے آتے ہیں - انگریز - فرنچ اور جرمن ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش میں ہیں - ایک زمانہ تھا کہ وہ پہلی قومیں علم و ہنر و تربیت و شائستگی میں اپنے دور میں اپنی ہمعصر[3] قوموں سے مقدم اور اعلیٰ تھیں - اور شائد مسلمانوں کو یہ بھی عزت تھی کہ وہ یورپ کی بعض قوموں کے لئے بمنزلہ استاد کے گنے جاتے تھے - مگر اسی عیب نے جو اُن قوموں میں تھا - اور اب بھی ہے - اور اسی خوبی نے جو پچھلی قوموں میں تھی اور اب بھی ہے - ٹھیک ٹھیک معاملہ بالعکس[4] کر دیا ہے - اب یورپ کی قومیں ایشیا کی قوموں سے علم و ہنر تربیت و شائستگی میں اعلیٰ ہیں - پس میرا مطلب صرف یہی ہے کہ ہماری قوم کو بھی چاہیئے کہ اپنے دماغ کو ان بیہودہ اور لغو خیالات

---

[1] کسی شے کو ایجاد کرنا - نکالنا ٭ [2] یعنی جو کچھ پہلے زمانہ کے لوگوں نے لکھدیا ہے اُسی کو وحی آسمانی خیال کرتے ہیں - اور اُس سے سر مو تجاوز کرنیکو کفر سمجھتے ہیں اور حق تعالیٰ کے عطیہ اعظم یعنی عقل جو اُس نے انسان کو عطا کی ہے اُس سے کام نہیں لیتے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری ترقی محدود ہے اور ہم قدامت پرست کہلاتے ہیں ٭ [3] وہ جو ایک ہی زمانہ میں ہوں ٭ [4] اُلٹ - خلاف ٭

سے جنہوں نے ان کی عقل اور سمجھ کو بالکل خراب کر رکھا ہے۔ اور
ان کی تمام خوبیوں کو خیالات فاسد کے کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ کر دیا ہے
خالی کریں۔ اور علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی میں ترقی
کرنے کی کوشش کریں۔ اور انصاف سے دیکھیں کہ ان کی تہذیب و
شائستگی میں نقصان ہونے کے سبب سے ان کی قوم کی کیسی بدنامی
ہے۔ اور ان عمدہ اخلاق اور قواعد کو جو خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام
کی بدولت ان کو دیئے تھے بُری طرح استعمال میں لانے اور ان کو
بدصورت کر دینے سے غیر قومیں اسلام کو ہماری نالائقی کی بدولت کیسی
حقارت اور نفرت سے دیکھتی ہیں۔ کیسے خندہ[1] زن اشارات[2] اور
کنایات[3] اس پر کرتی ہیں۔ اور ہماری شامت[4] اعمال کو نتیجہ مذہب
اسلام ٹھہراتی ہیں۔ ان کا ایسا کہنا اور خیال کرنا کچھ بیجا نہیں ہے
اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ سکے۔ مسلمانوں کی
حالت اور ان کے چال چلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے۔
سو انہوں نے اس کو ایسا بدصورت بنایا ہے۔ کہ جو کوئی نفرت کرے
کچھ تعجب نہیں۔ پس اب میری یہ خواہش ہے۔ کہ مسلمان اپنے اخلاق
اور تہذیب و شائستگی کی درستی میں کوشش کر کر اور اپنے حال
اور چال چلن کو درست اور عمدہ کر کر اسلام کی جو اصلی صورت
ہے وہ دنیا کو دکھا دیں ٭

---

[1] مضحکہ خیز۔ تمسخر انگیز ٭ [2] جمع اشارہ ٭ [3] جمع کنایہ ٭
[4] ہماری بدعملی۔ بے راہ روی ٭

۴۔ رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

ہم اپنے اس آرٹیکل کو بعض بڑے بڑے حکیموں[1] کی تحریروں سے اخذ کر کر[2] لکھتے ہیں۔ کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ "انسان کی زندگی کا منشاء[3] یہ ہے۔ کہ اس کے تمام قوئی اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں۔ اور ان میں باہم نامناسبت[4] اور تناقض[5] واقع نہ ہو۔ بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو" مگر جس قوم میں کہ پرانی رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے۔ یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا مطعون[6] اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں زندگی کا منشا معلوم ہو جاتا ہے"

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے۔ ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس کا کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی[7] نہیں ہے۔ بلکہ اگلی روائتوں پر یا پرانی رسم ورواج پر مبنی ہے۔ تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے۔ اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے۔ تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی ناپید[8] ہوتا ہے۔

---

[1] دانا۔ عقلمند ۔ [2] نکالنا۔ حاصل کرنا ۔ [3] مراد مقصد ۔ [4] باہم لگاؤ۔ نہ رکھنا۔ آپس میں نسبت نہ رکھنا ۔ [5] مخالف ہونا۔ ایک دوسرے کو توڑنا ۔ [6] جس کو طعنہ دیا گیا ہو ۔ [7] موقوف نہیں ۔ [8] گم ۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی۔ کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید[1] کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ کوئی شخص یہ کہیگا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروباری کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بھی نہ کرنی چاہیئے سیدھا طریقہ یہ ہے۔ کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیئے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں ان کے فوائد سے مستفید[2] ہو۔ اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے ؛

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنیسے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدائے تعالےٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز[3] کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل[4] ہوتی ہیں۔ صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے۔ وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں

---

[1] پیروی کرنا ؛ [2] فائدہ حاصل کریں ؛ [3] فرق کرنے ؛ [4] استعمال ہوتی ہیں ؛

کو اور تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت[1] تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے۔ وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ زمانہ حال پر نظر کرنے کے لئے اس کو قوت[2] تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار غور کرنے کے لئے قوت تجویز[3] اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوت استقرار[4] اور برا بھلا ٹھہرانے کو قوت امتیاز[5] اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اُس پر قائم رہنے کے لئے قوت استقلال[6] اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اسی کو انجام دیا کرے بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو ان اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں۔ اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے پھولے اور پھلے؛

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ و مفید ہیں اُن کو اختیار کریں۔ جو قابل اصلاح ہوں اُن میں ترمیم کریں اور جو بری اور خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں۔ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اُسی سے لپٹے رہیں؛

---

[1] جس طرح بندر دوسروں کی نقلیں اُتارتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو اپنے دماغ کو کام میں نہیں لاتے اور اندھا دھند قدیم رسم و رواج کی پیروی کرتے ہیں محض نقال ہوتے ہیں [2] وہ طاقت جس کے وسیلہ سے انسان کسی امر کی جانچ پڑتال کرے؛ [3] فیصلہ کرنا؛ [4] وہ قوت جو تلاش و جستجو اور پیروی پر آمادہ کرے؛ [5] وہ قوت جو مختلف اشیا میں تمیز کرنا یا فرق کرنا سکھلائے؛ [6] وہ قوت جو مستقل مزاجی۔ اور ثابت قدمی کا سبب ہو؛

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بُری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس کے رسومات کی پابندی نہیں کی بلکہ یہ باعث ہے کہ اُس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب[1] نہ ہو ؛

ہمارے زمانہ میں ہر شخص اعلےٰ سے لیکر ادنےٰ تک رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند یا ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں اُن کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے اور کونسی بات اُن کی ترقی اور شگفتگی کی معاون[2] ہے بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبے کے کونسی چیز مناسب ہے۔ میرے رتبے اور مقدور[3] کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں۔

---

[1] کسی کام کا مرتکب نہ ہو۔ یعنی نہ کرے ؛ [2] مددگار ؛ [3] طاقت۔ حیثیت ؛

اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہُوا۔ تو وُہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں اور رتبہ اور مقدور میں زیادہ ہیں۔ وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں تا کہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کر انہیں ہی کی سی شان میں شامل ہو؟

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجا لاتے ہیں۔ وُہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں لمور ترجیح دیکر پسند کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور کسی بات کی خواہش کرنیکا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا اور اس لئے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی پابندی کی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں اُنمیں بھی اوروں کے مطابق کام کرنیکا خیال اوّل دل میں آتا ہے غرضیکہ اُنکی پسند وہی ہوتی ہے جو عام پسند ہول لمور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو اُس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرنے سے انمیں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی۔ کہ جسکی پیروی کریں اور انکی ذاتی قوتیں بالکل پژمردہ اور بیکار رہنے کے سبب بالکلیہ ضائع ہو جاتی ہیں اور وُہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اور ذاتی خوشی اٹھاتے کے قابل نہیں رہتے اور عموماً ایسی طبعزاد رائیں یا خیالات نہیں رکھتے جو خاص اُنکی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں۔ اب

۱؎ برداشت کرنا۔ اٹھانا ٭ ۲؎ اطاعت گذار ٭ ۳؎ بچنا۔ پرہیز کرنا ٭ ۴؎ بالکل پورے طور پر ٭ ۵؎ وہ آزادہ خیالات جو کسی شخص کی اپنی طبیعت کی پیداوار ہوں ٭

غور کرنا چاہیئے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟
رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اُس زمانہ میں جبکہ وُہ مقرر ہوئیں مفید تصوّر کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے ان کا تجربہ صحیح نہ ہو یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو یا اس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو یا وُہ رسم اُس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو۔ الّا حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو۔ یا وُہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وُہ حالت نہ ہو۔ غرض کہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودت طبع اور قوت ایجاد باطل ہو جاتی ہے؀

یہ بات بیشک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی۔ بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے رسومات کی پابندی میں اُس کی بھلائی و بُرائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے اور دوسری حالت میں جو پسندیدہ ہونے کے اور اس لئے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں وُہ معدوم و مفقود نہیں ہوئیں۔ الّا پہلی حالت میں معدوم[1] و نابود ہو جاتی ہیں؀

---

[1] یعنی جو اشخاص اپنے آپ کو رسم و رواج کا پابند کر دیتے ہیں اور ان رسوم کی بُرائی و بھلائی پر اُنکی نظر نہیں ہوتی وہ آہستہ آہستہ اپنی قوتِ عمل تیزی ذہن اور قوت ایجاد کو کھو بیٹھتے ہیں یا فنا ہو جاتی ہیں؀

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع وؔ مزاحم ہے چنانچہ وہ پابندی ایسی قوتِ ؔ طبعی ہے جس کے ذریعہ سے بہ نسبت معمولی باتوں سے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے برابر مخالف رہتی ہے۔ اور انسان کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتا ہے ؛

اب اس رائے کو دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کرو تمام مشرقی یا ایشائی ملکوں کا حال دیکھو کہ اُن ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ اُن ملکوں میں مذہب اور استحقاقؔ اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ بس اب دیکھو کہ مشرقی یا ایشائی قوموں کا حال جن میں مسلمان بھی داخل ہیں۔ کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل ہے ؛

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوت عمل و جودت طبع اور مادہ ایجاد ضرور موجود ہوگا۔ جسکی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں۔ جواب رسمیں ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ یہ سب باتیں اُنہوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں اور انہیں وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہوگئے تھے مگر اب اُنکا حال دیکھو کیا ہے۔ ایسی رسومات کی پابندی سے اُنکا مآل یہ ہوا ہے کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں

---

۱ رکاوٹ ؛ ۲ منسوب بہ طبع ؛ ۳ حق حقوق ؛ ۴ تیز فہمی۔ چالاکی ؛ ۵ انجام ؛ ۶ مطیع۔ غلام ؛

ذلیل ہیں جن کے آباؤ اجداد اس وقت جنگلوں میں آوارہ پڑے پھرتے تھے جس وقت اُن قوموں کے آباؤ اجداد عالیشان محلوں میں رہتے تھے اور بڑے بڑے عبادت خانے اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے اس کا سبب یہی تھا کہ اُس زمانہ میں اُن موقوں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی اور جو کسی قدر تھی تو اس کے ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش اُن میں قائم تھا ؛

تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اُس کے بعد ترقی مسدود[1] ہو جاتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اُسی وقت مسدود ہوتی ہے جبکہ اُس قوم میں سے وُہ قوت اُٹھ جاتی ہے۔ جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے بلکہ میں نے غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونیکا زمانہ بھی گذر گیا اور تنزّل[2] اور ذلت وخواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے ؛

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں۔ بہت سی رسمیں ہیں اور ان رسموں کی نہایت درجہ پابندی ہے تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں ؛

یہ اعتراض صحیح ہے اور درحقیقت یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی جیسے کہ اب تک ہوتی

---

[1] رُک جاتی ہے۔ بند ہو جاتی ہے ؛ [2] زوال ؛

رہی ہے تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آویگا ۔ مگر یورپ میں اور مشرقی[1] ملکوں کی پابندی رسومات میں ایک بڑا فرق ہے ۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں ۔ فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جائیگی اور نئی رسم اخذ کر لی جاویگی ۔ اور اس سبب سے ان لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوت ایجاد ضائع نہیں ہوتی ؛

تم دیکھو ۔ کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے انکے باپ دادا کی نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے ۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا ۔ اُس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضروری سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا مثل اوروں کی لباس پہنے ۔ اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے برخلاف مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اُس پر اتفاق کریں اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے اور اسی تبدیلی کیساتھ انکی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے ۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور تا وقتیکہ اُنکی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں وہ بدستور رہتی ہیں ملکی معاملات اور تعلیم میں بلکہ اخلاق میں بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں ۔ پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے مگر دوسری قسم کی

---

[1] ہم مشرقی لوگ قدیم رسم و رواج میں کسی قسم کی اصلاح کرنیکے مجاز نہیں لیکن مغربی لوگ جب کبھی کوئی اچھی تبدیلی یا ترمیم مناسب سمجھتے ہیں تو وہ قدیم رسوم میں کر دیتے ہیں اور اگر کسی قدیم رسم کی جگہ کوئی ایسی نئی رسم نکالدی جائے جو اُس قدیم رسم کے مقابلہ میں زیادہ نافع ہو تو وہ اُسے اختیار کر لیتے ہیں جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُنکے قوائے عقلی اور قوت تمیز اور قوت ایجاد فنا نہیں ہوتی بلکہ انمیں ترقی ہوتی رہتی ہے ؛

رسموں میں مبتلا ہے محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے ۔

البتہ یورپ میں اور بالتخصیص[1] انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے اور در حقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہوسکتی وہی بات اُسکی تنزل کا باعث ہوگی بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی ۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حُبِّ وطن میں نامی ہیں اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہوجاویں اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالانکہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں اور جن کے سبب انکی خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں ۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ اور مختلف ہمسایوں کے لوگ اور مختلف پیشہ والے گویا جدی جُدی دُنیا میں رہتے تھے یعنی سب کا طریقہ اور عادات جدا جدا تھی ۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہوگئی ہیں[2] کہ گویا سب کے سب ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں ۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہوگیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اور ایک ہی باتیں سنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں اور ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے اور ان

---

[1] خاص طور پر ۔ [2] ملتی جلتی ہیں ۔

حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں[1] ہیں اور مشابہت[2] اور مساوات[3] روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اس کو اور زیادہ وسعت[4] ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں۔ اور عام ذخیرہ حقائق[5] اور مسائل[6] اور رایوں کا موجود ہے۔ اُس پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع[7] اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اور ہر قسم کی مالی ہمتی بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص اُن کے کرنے کو موجود و مستعد[8] ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا۔ بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے۔ اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امورات رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہنچنے کا بھی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے عمدہ نہیں ہو سکتا۔ مگر باوصف اُس کے ہم اس نتیجہ کو بشرطیکہ

---

[1] ایک جیسے ‡ [2] ایک دوسرے جیسا ہونا ‡ [3] برابری ‡ [4] وسیع کرنا۔ ترقی کرنا ‡ [5] جمع حقیقت کی ‡ [6] جمع مسئلہ ‡ [7] جمع ہونا اکٹھا ہونا ‡ [8] تیار ہونا ہے ‡

اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے باعث تنزل[1] قرار دیتے ہیں تو ضرور ہم کو کہنا پڑیگا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہوگا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو انکی طبیعتوں میں سے وُہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حُسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں۔ زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے اور پھر ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے ؛

اس معاملہ میں ہم کو مُلک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت[2] ہوتی ہے۔ چینی بہت لائق آدمی ہیں بلکہ بعض باتوں پر لحاظ کیا جائے تو عقلمند بھی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ اُنکی خوش قسمتی سے ابتدا میں ہی اُن کی قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں قائم ہو گئیں اور یہ کام اُن لوگوں کا تھا جو اُس زمانہ کے بہت دانا اور بڑے حکیم تھے ؛

چین کے لوگ اس بات میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش اور عقل کی باتیں اُن کو حاصل ہیں اُنکو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش[3] کرنے کے واسطے اور اس بات کیلئے[4] جن شخصوں کو وُہ دانشمندی کی باتیں حاصل ہیں اُن کو بڑے بڑے عہدے ملیں۔ نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں اور وُہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں۔ بیشک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور[5] قائم رکھا انہوں نے انسان کی ترقی کے اسرار[6] کو پا لیا۔

---

[1] زوال کا سبب ؛ [2] نصیحت۔ سبق حاصل ہونا ؛ [3] نقش کرنے کے لئے ؛ [4] طریقہ ؛ [5] دراز۔ بھید ؛

اور اس لئے چاہئے تھا۔ کہ وہ قوم تمام دُنیا میں افضل[1] رہتی مگر برخلاف اس کے اُس کی حالت سکون پذیر[2] ہوگئی اور ہزاروں برس سے ساکن ہے اور اگر اُن کی کبھی کچھ اور ترقی ہوگئی۔ تو بیشک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہوگی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوُا۔ کہ اُس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہوگئی اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہوگئے۔ اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑگئے اور اس سبب سے وُہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے۔ ان میں معدوم[3] ہوگئیں ؞

پس جبکہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط[4] سے آگئی ہے جسمیں ہزاروں نقص اور بُرائیاں ہیں پھر ہم ان رسوموں کے پابند ہوں اور نہ اُنکی بھلائی بُرائی پر غور کریں اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں۔ بلکہ اندھا دھندی سے انھی کی پیروی کرتے چلے جاویں تو سمجھنا چاہئے کہ ہمارا حال کیا ہوگیا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے ؞

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہوگئی ہے اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں۔ اس لئے بجز اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے

---

[1] فضیلت والی۔ عزت والی ؞ [2] خاموش۔ بلا کسی جنبش اور حرکت کے ؞
[3] مٹ گئیں ؞ [4] میل جول ؞

قوائے عقلی کی تحریک[1] کا باعث ہو اور کچھ چارہ[2] نہیں بعد اس کے کہ ہمارے قوائے عقلی تحریک میں آجاویں اور پھر قوت ایجاد[3] ہم میں شگفتہ ہو تب ہم پھر اس قابل ہوں گے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں ؛

مگر جب کہ ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب[4] نفرت رکھیں۔اور کوئی نیا طریقہ زندگی کا کہ وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بسبب اپنے یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب[5] سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے ؛

مگر جو کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جسکو ہم دل سے سچ مانتے ہیں۔اس لئے ہم کو مذہبی پابندی ضروری ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ جو معاشرت اور تمدن اور زندگی بسر کرنے اور دنیاوی ترقی کی اختیار کرتے ہیں اُس کی نسبت اتنا دیکھ لیں کہ وہ مباحات[6] شرعیہ میں سے ہے یا محرمات[7] شرعیہ میں سے درصورت[8] ثانی بلاشبہ ہم کو احتراز[9] کرنا چاہئے۔اور درصورت اول بلالحاظ پابندی رسوم کے اور بلالحاظ اس بات کے کہ لوگ ہم کو برا کہتے ہیں یا بھلا اُس کو اختیار کرنا ضرور بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے ؏

خدا ہمہ مسلماناں[10] را بریں کار توفیق وہد آمین

---

[1] حرکت میں لانیکا ؛ [2] علاج ؛ [3] پیدا ؛ [4] دشمنی ؛ [5] بُرا ؛ [6] وہ امور جو مذہب اسلام کی رُو سے جائز ہوں ؛ [7] وہ امور جنہیں اسلام نے ناجائز ٹھہرایا ہو ؛ [8] دوسری صورت میں ؛ [9] پرہیز کرنا ۔ بچنا چاہیئے ؛ [10] خدا ہر مسلمان کو اس پر عمل کرنیکی توفیق عنایت کرے ؛

۵ - عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ[1] ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد
دونوں باعتبار آفرینش[2] کے مساوی[3] ہیں دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔
کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جائے۔ اگر
تمثیلاً[4] کہا جاوے کہ عورت انسان کیلئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور
مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے۔ یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے
اور مرد بمنزلہ روپیہ کے۔ تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔ باایںہمہ[5] ہم
دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت[6] عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی
ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے
اُس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ انگلینڈ
جو عورتوں کی آزادی کی بڑی حامی کار ہے۔ جب اس کے قانون پر جو
عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن
لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لایعقل[7] اور لاشے[8] سمجھا ہے۔
انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم
الوجود متصور ہوتی ہے[9] اور ذات شوہر سے مبدّل[10] ہو جاتی ہے۔
وہ کسی قسم کے معاہدہ[11] کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لئے

---

[1] مہذب اور تعلیم یافتہ ممالک ۔ [2] بلحاظ پیدائش ۔ [3] برابر ہیں ۔
[4] بطور مثال کے ۔ [5] باوجود ان تمام باتوں کے ۔ [6] عزت و مرتبہ ۔ [7] بیوقوف
ناچیز ۔ [8] اُس کی کوئی ہستی نہیں سمجھی جاتی ۔ [9] تبدیل ہو جاتی ہے ۔ [10] وہ بلا مرضی
شوہر کسی قسم کا معاہدہ کرنے کی مجاز نہیں ۔

وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلا شوہر کی مرضی کے لکھی ہو۔ ذمہ وار نہیں ہو سکتی ۞

جو ذاتی اسباب اور مال ونقد وجائیداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی کے بقبضہ شوہر آجاتی ہے ۞

جو جائیداد کہ عورت کو وراثتاً[1] قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو اُس سب پر اُس کا شوہر تاحین حیات[2] قابض ہو جاتا ہے اور وہی اس کا محاصل[3] لیتا ہے ۞

وہ مثل لایعقل[4] شخص کے نہ کسی پر دعوےٰ کر سکتی ہے اور نہ اُس پر کوئی دعوےٰ رجوع[5] کر سکتا ہے ۞

وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی اور کوئی چیز بیع[6] نہیں کر سکتی ۞

وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے خرچ کے جو ضروریات زندگی کے لئے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر مرضی شوہر کے نہیں کر سکتی ۞

۱۸۷۰ء میں پارلیمنٹ میں منکوحہ[7] عورتوں کی جائیداد کا ایک بل پیش ہوا تھا۔ اس میں صرف یہ بات چاہی گئی تھی۔ کہ وہ قانون جس کی رو سے بعد شادی کے عورت اپنی جائداد سے محروم ہو جاتی ہے منسوخ کیا جاوے ۞

---

[1] وراثت کے طور پر ۞ [2] زندگی بھر کے لئے ۞ [3] محصول آمدنی وغیرہ ۞
[4] دیوانہ۔ جنونی۔ پاگل۔ بے عقل ۞ [5] نہ اس پر کوئی دعوےٰ ہو سکتا ہے ۞
[6] فروخت نہیں ہو سکتی ۞ [7] شادی شدہ ۞

آنریبل مسٹر رسل گرے ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون پیش کیا تھا
اُس وقت اُنہوں نے نہایت لطیف بات یہ کہی تھی کہ قانون کے بموجب
جو کچھ جائیداد عورت کے پاس قبل شادی ہوتی ہے اور بعد شادی ملتی ہے
اور جو کچھ کہ وہ اپنی محنت اور لیاقت سے کماتی ہے۔ بعد شادی کے وہ
اس کا نہیں رہتا۔ سب پر شوہر مالک ہو جاتا ہے پس شادی کا اثر اُس
عورت پر ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کسی جرم قابل ضبطی جائیداد کا ہوتا ہے ؎
اس گفتگو پر تمام ہوس آف کامنز ہنس پڑا اور اکثر ممبروں نے
آنریبل مسٹر رسل گرے کی تائید کی۔ پس انگلستان کے قانون کا عورتوں
کی نسبت یہ حال ہے اور غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ خراب اور
مضرت رساں[1] اور نا انصاف نہ ہوگا ؎

۶۔ تعلیم و تربیت

ایک مصنّف کی ایک بات کو ہم اپنی طرز پر اپنے لفظوں میں بیان
کرتے ہیں :۔
تعلیم اور تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے بلکہ وہ جُدا جُدا دو چیزیں
ہیں۔ جو کچھ کہ انسان میں ہے اسکو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے۔ اور
اس کو کسی کام کے لائق کرنا اس کا تربیت کرنا ہے مثلاً جو قوتیں کہ خدا تعالےٰ
نے انسان میں رکھی ہیں۔ اُن کو تحریک دینا اور شگفتہ[2] و شاداب کرنا انسان کی
تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن[3] اور مجمع[4] بنانا اس کی تربیت ہے ؎

---

[1] نقصان دِہ۔ ضرر رساں ؎ [2] تازہ سبز سبز ؎ [3] خزانہ ؎ [4] جمع ہونے کی جگہ ؎

انسان کو تعلیم دینا در حقیقت کسی چیز کا باہر سے اسمیں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اس کے سوتوں[1] کا کھولنا اور اندر کے سرچی چشمہ[2] کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو صرف اندرونی قوائے کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے۔ اور انسان کو تربیت کرنا اُس کیلئے سامان مہیا کرنا اور اس سے کام کا لینا ہے۔ جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا اور حوض بنا لے کے بعد اس میں پانی کا بھرنا۔ پس تربیت پانے سے تعلیم کا بھی پانا ضرور نہیں ہے۔ تربیت جتنی چاہو کرو۔ اور اس کے دل کو تربیت کرتے کرتے منہ تک بھر دو۔ مگر اس سے دل کی سرچی سوتیں نہیں کھلتیں۔ بلکہ بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ اندرونی قوائے کو حرکت دیئے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو اور تعلیم بہت بُری ہو یہی ٹھیک ٹھیک حال ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو تو طمطراق[3] بہت کچھ مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔ بھاری بھرکم تو عمامہ[4] و دستار و جبہ[5] اور کرتہ بہت بہت کچھ مگر دل کی اور اندرونی قوی کی شگفتگی دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنےٰ اور سب سے حقیر جزو ہے بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جس میں اندرونی قوی کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو جسقدر دل کے قویٰ کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں ویسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے۔ ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ اُن کے

---

[1] چشمے ؛ [2] الٰہی چشمے۔ فطرتی چشمے ؛ [3] ٹیپ ٹاپ۔ شان و شوکت ؛ [4] پگڑی۔ دستار ؛
[5] چوغہ۔ جامہ ؛

۷ - کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے۔ جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے ؛

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لئے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے۔ کہ بمجبوری اُس کے لئے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوٹ ہی جاتی ہے اور اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات[1] کا سامان مہیّا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبیعتِ ثانی[2] ہو جاتی ہے مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت[3] ہو جاتے ہیں ؛

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں۔ اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شائد ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لادے لیکن اگر انسان اُن عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بیکار ڈال دے۔ تو وہ نہایت سخت کاہل اور

---

[1] گذران ؛ [2] Second nature ؛ [3] حیوانوں کی طرح ہو جاتے ہیں ؛

روحانی قویٰ بالکل نیست ونابود[1] ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر وغرور اور اپنے آپ کو بے مثل ونظیر قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں۔ اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط[2] سے بہم پہنچیں اُن کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور اُن سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور ایسے بیل کی مانند ہو جاتے ہیں۔ جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ میں ہی رہنے کی خواہش کرتا ہے پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وُہ کتابیں اور علم خود ہر بوجھ ہوتا ہے ٭

اس تقریر سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل ہے یہی ہے کہ ہم نے اپنے دل کو اور اپنے اندرونی قویٰ کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ علم جو حاصل کرتے ہیں وُہ بھی بعوض اس کے کہ روحانی قویٰ کو شگفتہ وشاداب کرے اُن کو پژمردہ[3] کر دیتا ہے اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں بالکل کمزور اور ناکارہ[4] کر دیتا ہے اور ہماری حالت تمام معاملات میں کیا دین کے اور کیا دُنیا کے خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہیئے اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہیئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ وشاداب کرے اور دل کی سوتوں کو کھول کر سرچی چشمہ سے پانی باہر نکالے۔ جس سے ہماری زندگی سرسبز وشاداب ہو ٭

---

[1] فنا ٭ [2] کثرت سے ٭ [3] مرجھا دیتا ہے ٭ [4] بے کار ٭

وحشی ہو جاتا ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب
کہ اُس کے دلی قویٰ[1] کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی
جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے پس ہر ایک انسان پر لازم ہے
کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے[2] اور انکو بیکار نہ چھوڑے
ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو
مناسب ہو اور اس کے حاصل کرنے میں اُس کو چنداں محنت و مشقت
کرنی نہ پڑے۔ جیسے کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لااخراج داروں کا
حال تھا۔ اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بیکار ڈال دے تو اسکا حال کیا ہوگا
یہی ہوگا۔ کہ اس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاوینگے
شراب پینا اور مزیدار کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قماربازی[3] اور تماش بینی[4] کا
عادی[5] ہوگا اور یہی سب باتیں اُس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں البتہ
اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ بدسلیقہ وحشی ہوتے ہیں اور یہ
ایک وضعدار[6] وحشی ہوتا ہے۔ شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا
اور پیچوان کے دھوئیں اُڑانا اس کو پسند ہوتا ہے اور جنگل کے
ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اڑانا اُس کو
پسند ہوتا ہے۔ پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق
سے کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی ؛

---

[1] یعنی اس کے دل میں کام کرنیکا جوش باقی نہیں رہتا ؛ [2] اپنے دل و دماغ کو زندہ رکھنے
کی کوشش کرے۔ ان کو بیکار نہ رہنے دے ؛ [3] جوئے بازی ؛ [4] بدمعاشی ؛
[5] عادت پڑ جائے گی ؛ [6] بدتمیز۔ غیر مہذب ؛ [6] مہذب

ہم[1] قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کیلئے ایسے کام بہت کم ہیں جن میں اُن کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانیکا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولائیتوں میں اور خصوصاً انگلستان میں وہاں کے لوگوں کیلئے ایسے موقع بہت ہیں اور اس میں بھی کچھ شک نہیں۔ کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاوینگے مگر ہم اپنے ہموطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے دلی قوٰی کو بیکار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانیکا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو۔ اگر اسکے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اسی کی فکر اور کوشش چاہیئے۔ کہ وہ قصور کیونکر رفع ہو۔ غرضیکہ کسی شخص کے دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چاہیئے کسی نہ کسی بات

---

[1] ان سطور میں سر سید احمد خاں مرحوم نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ ہندوستانیوں کیلئے قوائے عقلی و قوائے دلی سے کام لینے کا بہت کم موقعہ رہ گیا ہے اگر اس کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ غلام قوم کے افراد کے تمام قوائے فکری و ذہنی مسلسل غلامانہ زندگی بسر کرلینے سے معطل ہوجاتے ہیں۔ قوائے ذہنی و فکری کی بیداری آزاد ملکوں اور آزاد قوموں میں پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مفتوحہ اقوام بمقابلہ فاتح اقوام کے ہمیشہ علمی۔ ذہنی۔ فکری۔ ادبی اور معاشرتی حیثیت سے کم درجہ رکھتی ہیں کیونکہ ان تمام چیزوں کی ترقی حکومت کی سرپرستی کی محتاج ہوتی ہے۔

کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات
کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی
یعنی دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چھوٹے گا۔ اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی
بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ؎
بیکار مباش کچھ کیا کر گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

۸۔ اخلاق

مسٹر اڈیسن کا قول ہے کہ مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔ ایک اعتقادیات[1]
دوسرا عملیات[2]۔ مسٹر اڈیسن کی غرض اعتقادیات سے صرف وہ مسائل[3] ہیں
جو وحی سے معلوم ہوئے اور جو عقل سے یا کارخانہ قدرت[4] پر غور کرنے سے
معلوم نہیں ہو سکتے۔ مگر ہم کو اُن کے اس بیان سے کسی قدر اختلاف ہے
ہم اعتقادیات اُن مسائل کو سمجھتے ہیں۔ جن کا ہونا عقل و نیچر یعنی کارخانہ
قدرت کے اصول پر نا ممکن نہیں ہے۔ اِلّا[5] ہم اُن دونوں کی بنا پر اُن کے
ہونے کا یقین نہیں کر سکتے تھے۔ وحی[6] نے صرف ان کے ہونے پر جب وُہ
ہوں ہم کو یقین دلایا ہے یا اُن کا ہونا بتایا ہے۔ ہم نے اُس مقام پر حرف
تردید کو اسلیئے استعمال کیا ہے کہ ہم کو اس بات میں شبہ ہے کہ اُن مسائل
پر جن کو ہم نے اعتقادیات میں داخل کیا ہے یقین لانا جزو ایمان ہے، یا نہیں
عملیات میں مسٹر اڈیسن نے اُن مسائل کو داخل کیا ہے جن کو عقل و نیچر

---

[1] اعتقادات۔ جمع اعتقاد کی ؛ [2] جمع عمل کی ؛ [3] جمع مسئلہ ؛ [4] مراد تمام
دنیا کائنات ؛ [5] مگر ؛ [6] الہام۔ وُہ بات جو خدا کی طرف سے کسی انسان کے دل میں
پیدا ہو ؛

کے مطابق مذہب نے بھی ہدایت کی ہے۔ پس وہ پہلے حصے کا نام عقائد رکھتے ہیں اور دوسرے حصے کا نام اخلاق ؛

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ہم اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اعتقادیات پر اس قدر خیال کرتے ہیں کہ اخلاق کو بالکل بھول جاتے ہیں اور بعضے اخلاق پر ایسے متوجہ ہوتے ہیں کہ اعتقادیات کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ صاحب کمال آدمی کو ان دونوں میں سے کسی بات میں ناقص نہ رہنا چاہیئے جو لوگ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہر ایک سے کیا کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے وُہ دل سے ہمارے اس بیان کی تصدیق کریں گے ؛

افسوس ہے کہ اس مقام پر بھی مجھ کو مسٹر اڈیسن سے کچھ تھوڑا سا اختلاف[1] ہے پچھلا حصہ اس کے مضمون کا نہایت سچ ہے مگر پہلے حصے میں کچھ غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ اعتقادیات میں اور عملیات میں جسکو مسٹر اڈیسن اخلاق کہتے ہیں کچھ علاقہ نہیں ہے۔ انسان اعتقادیات پر کتنا ہی زیادہ خیال کرے۔ اس کے اخلاق میں کچھ تفاوت[1] نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اخلاق پر کیسا ہی متوجہ ہو اس کے اعتقادیات میں کچھ نقصان نہیں آ سکتا کیونکہ یہ دونوں کام دو جُدا جُدا آلوں اور دو جُدا جُدا شخصوں سے متعلق[2] ہیں۔ پہلا ہمارے دل یا ہماری روح اور خدا سے۔ دوسرا ہماری ظاہری حرکات اور جذبات اور انسان سے ؛

پھر وُہ لکھتے ہیں کہ گو مذہب اخلاق اور اعتقاد پر منقسم[3] ہے۔ اور ان دونوں میں خاص خاص خوبیاں ہیں مگر اخلاق کو اعتقاد پر اکثر باتوں میں ترجیح[4] ہے ؛

---

[1] فرق۔ اختلاف ؛ [2] تعلق رکھتے ہیں ؛ [3] تقسیم شدہ ؛ [4] فضیلت ؛

۱۔ کیونکہ اخلاق کی اکثر باتیں نہایت صحیح اور نہایت مضبوط ہیں یہاں تک کہ اگر اعتقاد بالکل قائم نہ رہے تب بھی وُہ باتیں (یعنی اخلاق کے مسائل) بدستور قائم رہتے ہیں ؛

۲۔ جس شخص میں اخلاق ہے اور اعتقاد نہیں وُہ شخص بہ نسبت اُس شخص کے جس میں اعتقاد ہے اور اخلاق نہیں انسان کیلئے دنیا میں بہت زیادہ بہتری کر سکتا ہے اور میں اس قدر اور زیادہ کہتا ہوں کہ انسان کے لئے دین اور دُنیا دونوں میں بہت زیادہ بھلائی کر سکتا ہے ؛

۳۔ اخلاق انسان کی فطرت کو زیادہ کمال بخشتا ہے کیونکہ اس سے دل کو قرار و آسودگی[1] ہوتی ہے۔ دل کے جذبات اعتدال[2] پر رہتے ہیں اور ہر ایک انسان کی خوشی کو ترقی ہوتی ہے ؛

۴۔ اخلاق میں ایک نہایت فائدہ اعتقاد سے یہ ہے کہ اگر وُہ ٹھیک ٹھیک ہوں تو تمام دنیا کی مہذب قومیں اخلاق کے بڑے بڑے اصولوں میں متفق ہوتی ہیں گو کہ عقائد میں وُہ کیسی ہی مختلف ہوں ؛

۵۔ کفر سے بھی بداخلاقی زیادہ بدتر ہے یا اس مطلب کو یوں کہو کہ اکثر لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک نیک چلن نپٹ جاہل[3] وحشی جس کو خدا کی باتوں کی خبر بھی نہیں پہنچی نجات پا سکتا ہے مگر بدچلن معتقد آدمی نجات نہیں پا سکتا ؛

۶۔ اعتقاد کی خوبی اسی میں ہے کہ اس کا اثر اخلاق پر ہوتا ہے اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ اعتقاد کی یعنی خدا کے دیئے ہوئے مذہب پر ایمان

---

[1] سکون و آرام ؛ [2] برابری پر۔ صحیح طور پر ؛ [3] بالکل جاہل جسکو کسی شے کا علم نہ ہو ؛

رکھنے کی خوبیاں کیا ہیں تو کیا ہم کو اس بات کی صحت جو ہم نے ابھی بیان کی بخوبی معلوم ہو جاویگی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی خوبیاں اِن باتوں میں ہیں جن کو میں بیان کرتا ہوں ؛

۱ ۔ اخلاق کی باتوں کو سمجھنا اور ان کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانا ۔

۲ ۔ نیک اخلاق پر عمل کرنے کے لئے نئے نئے اور قوی[1] اغراض کو بہم پہنچانا ؛

۳ ۔ خدا کی نسبت عمدہ خیالات پیدا کرنا اور اپنے ہمجنسوں میں اچھا برتاؤ کرنا جس سے آپس میں محبّت زیادہ ہو اور خود انسان اپنی سچّی حالت کو کیا بلحاظ اپنے نیچر کی خوبی کے اور کیا بلحاظ اس کی بدی کے بخوبی سمجھے ؛

۴ ۔ برائی کی برائیوں کو ظاہر کرنا ؛

۵ ۔ نجات کے لئے نیک اخلاق کو عام ذریعہ ٹھہرانا ؛

مذہب کی خوبیوں کا ایک مختصر بیان ہے مگر جو لوگ اس قسم کے مباحثوں میں مشغول رہتے ہیں وہ نہایت آسانی سے ان خیالوں میں ترقی دے سکتے ہیں اور مفید نتیجے ان سے نکال سکتے ہیں مگر میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ ان سب باتوں کا ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اخلاق میں کمال حاصل نہیں کر سکتا جب تک اخلاق کو عیسائی مذہب کا سہارا نہ ہو۔ قول مسٹر اڈلیسن کا ہے ۔ مگر میں[2] یہ کہتا ہوں کہ کوئی اعتقاد یا کوئی مذہب سچا ہو ہی نہیں

---

[1] مضبوط ؛ [2] دنیا میں صرف وہ مذہب قابل قبول ہے جسکی بنیاد محض اعتقادات ہی پر نہ ہو بلکہ اخلاق پر ہو ۔ جو مذہب انسانی اخلاق کو مہذب اور پاک نہیں بنا سکتا وہ کبھی بھی سچا مذہب نہیں کہلا سکتا میرے خیال میں مذہب کی غرض و غایت انسان کے اخلاق کو مہذب اور پاک بنانا ہے ؛

سکتا۔ جس کا نتیجہ اخلاق کی عمدگی نہ ہو۔ پس اخلاق کو کسی مذہب کا کچھ سہارا
درکار نہیں ہے بلکہ مذہب یا اعتقاد کے سچ سمجھنے کو اخلاق کا سہارا درکار ہے"

مسٹر اڈیسن اور بھی وہ ایک اصول قائم کرتے ہیں جو اس گفتگو سے
علاقہ رکھتے ہیں :۔

۱۔ دیکھتے ہیں کہ ہم کو ایسی بات کو اعتقاد کی جڑ نہ قرار دینا چاہیے
جس سے اخلاق کو استحکام[1] اور ترقی نہ ہوتی ہو ٭

۲۔ کوئی اعتقاد صحیح بنیاد پر ہی نہیں ہو سکتا جس سے اخلاق
خراب یا اُن میں تنزل ہوتا ہے ٭

یہ دونوں اصول مسٹر اڈیسن کے ایسے عمدہ ہیں کہ دنیا میں کوئی شخص
جس کے دل کی آنکھ خدا نے اندھی نہ کی ہو اُن سے انکار نہیں کر سکتا ٭

اس کے بعد مسٹر اڈیسن انہیں اصولوں پر ایک اور مسئلہ متفرع[2] کرتے
ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام مشتبہ مقاموں میں ہم کو غور کرنی چاہیے کہ اگر بالفرض
وہ غلط ہو تو اس سے کیا کیا بد نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً اپنے ایمان کے
مضبوط کرنے اور خیالی ثواب حاصل کرنے کی اُمنگ[3] میں لوگوں کو تکلیف
دینا۔ لوگوں کے دلوں میں رنج اور نفرت غصہ اور سخت عداوت پیدا کرنا اور
جس چیز پر اُن کو اعتقاد نہیں ہے بہ زبردستی ان سے قبول کروانا ایسے
جذبات میں ہم اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ان سب باتوں کے سوا ہم اُن کو دُنیا
کے فائدہ اور خوشی سے بھی محروم کرتے ہیں۔ اُن کے جسم کو تکلیف دیتے ہیں
ان کی دولت کو خراب کرتے ہیں۔ اُنکی عزت کو خاک میں ملاتے ہیں۔

---

[1] مضبوطی ۔ پختگی ٭ [2] شاخ کیا گیا۔ کسی چیز سے مانند شاخ کے باہر نکلنے والا ٭ [3] خواہش ٭

ان کے خاندانوں کو برباد کرتے ہیں۔ اُن کی زندگیوں کو تلخ کر ڈالتے ہیں یہاں تک کہ آخر کار اُن کو مار ڈالتے ہیں۔ پس جب کسی مسئلہ سے ایسے بد نتیجے نکلیں تو مجھ کو اس مسئلہ کے مشکوک[1] ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہتا جیسے کہ علم حساب میں دو اور دو چار ہوتے ہیں کچھ شبہ نہیں ہوتا ہیں ایسے مسئلہ کو اپنے مذہب کی بنیاد نہیں ٹھہرا سکتا۔ اور نہ اس پر عمل کر سکتا ہوں؛

اس قسم کے معاملات میں ہم صریح[2] اپنے ہمجنسوں کو ضرر[3] پہنچاتے ہیں اور جس مسئلہ سے ہم ایسا کرتے ہیں بلاشبہ وہ مشکوک اور قابل اعتراض ہے اخلاق اس سے بالکل خراب ہو جاتے ہیں؛

یہ مضمون مسٹر اڈیسن کا غالباً عیسائی مذہب کے اس زمانہ پر اشارہ ہے جب کہ رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ فرقہ میں دشمنی کی آگ بھڑک رہی تھی اور مرد اور عورت و بچے مذہب نہ ماننے پر آگ میں جلائے جاتے تھے اور نہایت بدبخت خونریزیاں جو درحقیقت کرسچانٹی کے بالکل خلاف ہو رہی تھیں؛

لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہب میں بھی ایسا ہی خونخوار امن اور اخلاق کے برخلاف جہاد[4] کا مسئلہ ہے اگر وہ مسئلہ درحقیقت ایسا ہی ہو کہ بعض یا اکثر حقیقت تک نہ پہنچنے والے یا خود غرض لوگوں نے سمجھا ہے یا اکثر ظالم و مکار مسلمان حکمرانوں نے برتا ہے تو اس کے اخلاق کے برخلاف

---

[1] جسکے متعلق شک کیا جائے۔ مشتبہ؛ [2] صاف طور پر۔ کھلے طور پر؛ [3] نقصان؛
[4] اسلامی شریعت کے مطابق جہاد کے معنی کسی مسلمان طاقت کا مذہب کی بناء پر کسی غیر اسلامی طاقت سے جنگ کرنا؛

ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ مگر ہمارا اعتقاد یہ نہیں ہے۔ بلکہ جو حقیقت جہاد کی درحقیقت مذہب اسلام کی رُو سے ہے وُہ اخلاق کے برخلاف نہیں ہے۔ اس میں کسی قسم کا جبر یا کسی کے مذہب کو مجبور ہونا یا مذہب کے لئے کسی کا خون بہانا مطلق نہیں ہے وُہ صرف نیشنل لا پر یعنی اُس قانون پر جو مختلف قوموں کو آپس میں برتنا چاہئے مبنی ہے اور جو آج کل کی مہذب قوموں میں جاری ہے ؛

اس مسئلہ کا ذکر ہم نے اپنی متعدد تصنیفات میں کیا ہے اور امید ہے کہ کبھی اس مضمون پر کوئی تحریر اس پرچہ میں بھی چھاپیں گے ؛

مسٹر اڈیسن اپنے اس مضمون کو کسی مصنّف کے نہایت عمدہ اور دل میں اثر کرنے والے کلام پر ختم کرتے ہیں۔ اور وہ کلام یہ ہے "آپس[1] میں نفرت پیدا کرنے کو تو ہمارے لئے مذہب کافی ہے مگر ایک دوسرے میں محبّت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں" ؛

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جو برتاؤ مذہبوں کا اس زمانہ میں ہے وُہ ایسا ہی ہے اور مُسلمانوں کا برتاؤ سب سے زیادہ بُرا ہے۔ مگر سچے مذہب کا یعنی اسلام کا سچا مسئلہ یہ ہے۔ کہ "خدا کو ایک جاننا اور انسان کو اپنا بھائی سمجھنا"۔ پس جو کوئی اس مسئلہ کے برخلاف ہے وُہ غلطی پر ہے ؛

---

[1] آجکل ہندوستان اپنی انتہائی بدبختی کی بناء پر مذہبی نفرت کا گہوارہ بنا ہُوا ہے حالانکہ دُنیا کا کوئی مذہب اس قسم کی شر انگیز اور امن عامہ کے تباہ کرنیوالی تعلیم کا پرچار نہیں کرتا یہ صرف خود ساختہ مذہبی لیڈروں کی عیاریاں ہے جو مذہب کی پاکیزہ تعلیم کو اتحاد و اتفاق محبت و آشتی کی ترقی کی بجائے نفرت و حقارت بغض و عداوت کے اظہار کا آلہ بنائے ہوئے ہیں۔ خدا ان کو ہدایت دے ۔ آمین ۔

۹ - ریا

دُنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن[1] کچھ ہوتا ہے دُنیا دار اور رند مشرب[2] آدمی جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں اُس سے زیادہ اپنے تئیں وُہ بد بناتے ہیں۔ دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں وہ تو دینداری کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں اور دن رات عشق و تماش بینی اور لچ پنے کی باتوں کی جنکو دراصل اُنہوں نے کیا بھی نہیں۔ گپیں اُڑاتے ہیں اور یہ حضرات بیشمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہری دینداری کے پردہ میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل[3] شکار کھیلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں بُرے نہیں ہیں مگر ایک اور تیسری قوم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں اور انہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اُنکی بناوٹ ایک اور ہی عجیب قسم کی ہے وُہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکا میں پڑتے ہیں یہ بناوٹ خود ان سے انہیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے جسقدر کہ درحقیقت وُہ نیک ہیں اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں کا خیال نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤد نے

---

[1] جنکی ظاہری حالت کچھ اور ہوتی ہے اور اندرونی کچھ اور۔ [2] رو باش مذہب سے آزاد۔ [3] یعنی۔ دینداری کے لباس میں لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

نہایت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اس طرح پر خدا کی مناجات کی ہے "کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر" جو لوگ علانیہ[1] بدی کرتے ہیں۔ اگر اُن کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کے لئے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ جو درحقیقت موت کی راہ چلتے ہیں اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے راستہ پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں۔ پس میں چند قاعدے بیان کرنا چاہتا ہوں جن سے میں وُہ بدیاں جو دل کے کانوں میں چھپی ہوتی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا معلوم ہو سکیں ؛

عام قاعدہ اُن کے لئے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپکو اُن مذہبی اصولوں سے جو ہماری ہدایت کے لئے مقدس کتاب اللہ میں لکھے ہیں جانچیں اور اپنی زندگی کو اس پاک شخص کی زندگی سے مقابلہ کریں جس نے یہ فرمایا ہے کہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحیٰۤ اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ"[2] اور جو اس درجہ کمال تک پہنچا جہاں تک انسان کا پہنچنا ممکن ہے اور جس کی زندگی ہماری زندگی کے لئے نمونہ ہے اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لئے بلکہ تمام دنیا کیلئے سب سے بڑا ہادی[3] اور بہت بڑا دانا اُستاد ہے۔ ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی بڑی غلطیاں پڑتی ہیں۔ کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور کچھ آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا اور کچھ زمانہ کے

---

[1] کھلے طور پر ؛ [2] میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں (فرق یہ ہے) کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے ؛ [3] راہبر۔ ہدایت دینے والا ؛

گذرنے سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت ان واقعات کی جو گذرے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں جو انسان کو ٹھیک ٹھیک مطلوبہ راہ پر لے آتے ہیں ؎

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے دل[1] کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں یا تو ہمارے عیب اُن کو عیب ہی معلوم نہیں ہوتے اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں۔ کہ ہم اُن کو نہایت ہی خفیف[2] سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈھ کر ہمارے عیب نکالتا ہے گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت بڑا کر دیتا ہے۔ مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے ؎

تا نباشد[3] چیزکے مردم بگو یند چیزہا

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو اس لئے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیئے کہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع[4] کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب اُن عیبوں کو چھوڑ دیا۔ تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا۔ جو ایک شفیق[5] اُستاد سے ملنا چاہیئے تھا ؎

---

[1] دل ؎ [2] معمولی۔ ہلکا ؎ [3] جب تک کوئی بات نہ ہو لوگ اس کے متعلق نہیں کہتے ؎ [4] اطلاع دیتا ہے۔ خبردار کرتا ہے ؎ [5] مہربان۔ ہمدرد ؎

دشمن جو عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے ہمارے فائدے سے خالی نہیں اگر وہ ہم میں ہوتا ہے تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو خدا کا شکر کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ "دشمن[1] از دوست ناصح تر ست ایں جز نکوئی نہ گوید و آں جز بدی نجوید"۔

پلوٹارک کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے اُس میں اُس نے یہ بات لکھی ہے کہ "دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں اُس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں اور ہماری گفتگو میں اور ہمارے چال چلن میں اور ہماری تحریر میں جو نقص ہیں وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں، تو ہم کو اس بات پر غور کرنی چاہیئے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں اُس میں سے ہم کس قدر کے مستحق[2] اور پھر یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ جن کاموں کے سبب سے وہ تعریف کرتے ہیں وہ کام ہم عمدہ غرض سے اور نیک نیتی سے دُنیا کو فائدہ پہنچانے کے لئے کرتے ہیں یا نہیں اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ نیکیاں جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں دراصل ہم میں کہاں تک ہیں۔ ان باتوں پر انسان کو بخوبی غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ہمارا یہ حال ہے کہ کبھی تو ہم لوگوں کی رایوں کو جو ہماری نسبت ہیں پسند کر کر اپنے تئیں بہت بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور کبھی ان کو ناپسند کرتے ہیں اور جو کچھ ہمارا دل کہتا ہے اس کے مقابلے میں اُن تمام رایوں

---

[1] دشمن دوست سے زیادہ ناصح ہے کیونکہ یہ یعنی دوست سوائے نیکی کے اور کچھ بیان نہیں کرتا اور وہ یعنی دشمن سوائے بدی کے اور کسی بات کا متلاشی نہیں ہوتا۔ [2] حق رکھتے ہیں۔

کو نہیں مانتے ؂

ہم کو ایسی نیکی پر بھی جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے زیادہ اصرار[۱] کرنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ ان لوگوں کی رایوں کی بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہیئے جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اور جو عقلمند اور نیک دل ہیں اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں۔ اُسی طرح وُہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں مگر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اُن اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادی رائے اور اُس دلی نیکی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے اختلاف کیا ہے یا کسی بیرونی دباؤ یا پابندی رسم و رواج اور تعصب[۲] اور تقلید[۳] نے ان کے دل کو پھیرا ہے کیونکہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو تو وُہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے ؂

جہاں ہم کو دھوکا کھانے کا احتمال[۴] ہے وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہیئے۔ حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب[۵] اور کسی خاص فرقہ کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو بُرا اور حقیر سمجھنا یہ ایسی باتیں ہیں۔ جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں وُہ فی نفسہ[۶] نہایت ہی بُری ہیں۔ گو کہ وُہ ہم سے کمزور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہوں مگر اس پر بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ایسے لوگ بھی دُنیا میں ہیں جو دینداری اور نیکی کیلئے نہایت مشہور رہیں مگر نہایت لغو[۷] اور نرے شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھ کر اپنے

۱؎ ضد ؂ ۲؎ دُشمنی ؂ ۳؎ پیروی ؂ ۴؎ گمان ۔ شک ؂ ۵؎ دُشمنی ؂
۶؎ اپنی اصلیت میں ؂ ۷؎ نکمّی چیز ۔ بیہودہ گفتگو ۔ بیہودہ باتیں ؂

دلوں میں اس کی جڑ گاڑ دی ہے۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی ایسا عقلمند اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا۔ جس میں پوری پوری یہ سب باتیں ہوں اور پھر بھی وہ گناہ سے پاک ہو ؛

اسی طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہیئے جو انسان کے کمزور دل کی قدرتی بناوٹ سے یا کسی خاص شوق سے یا کسی خاص تعلیم کے اثر سے یا کسی اور سبب سے ہوتی ہیں جس میں ہمارا دنیوی فائدہ ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی سمجھ نہایت آسانی سے حق بات کی طرف سے پھر جاتی ہے اور اس کا دل غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے تعصب اور ہزاروں غلطیاں اور پوشیدہ برائیاں اور لامعلوم عیب انسان کے دل میں گھس جاتے ہیں۔ جس کام کے کرنے میں عقل کے سوا اور جذبوں کی بھی ترغیب[1] ہو اُس کے کرنے میں عقلمند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا اور ہمیشہ اس پر شبہ کرنا چاہیئے کہ ضرور اسمیں کوئی نہ کوئی بُرائی چھُپی ہوئی ہے

ان اصولوں پر اپنے خیالوں کو جانچنا اور اپنے دل کو ٹٹولنا اور دل کے تاریک[2] جذبوں کو ڈھونڈھنا ہمارے لئے اُس سے بڑھ کر کوئی چیز مفید نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسی مضبوط نیکی بٹھانی چاہیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آوے۔ جس دن کہ ہمارے بھیدوں کا جاننے والا ہمارے دل کو جانچے گا۔ جس کی عقل اور انصاف کی کچھ انتہا نہیں تو ان اصولوں پر چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راہ نہیں۔ ہمارے بانی اسلام نے جب ہم کو یہ سکھلایا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر[3] ہے ہمارے دل کے چھپے بھیدوں کو

---

[1] رغبت دلانا۔ شوق۔ فریفتگی ؛ [2] اندھیرے ؛ [3] موجود ہے ؛

جانتا ہے تو اس نے کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریاکاری کی برائی ہم کو بتلادی جس سے انسان دنیا کو دھوکا دیتا ہے اور خود اپنے آپ کو بھی فریب میں ڈالتا ہے۔ داؤد نے بھی اپنی مناجات میں اس ریاکاری کے خوف کو جس سے انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے نہایت دلچسپ لفظوں میں ادا کیا ہے۔ یہاں اس نے کہا ہے کہ اے خدا مجھ کو جانچ میرے دل کی تہ کو ڈھونڈھ۔ میرے خیالوں کو دیکھ۔ مجھ کو بخوبی پرکھ کہ مجھ میں کس برائی نے راہ کی ہے اور مجھ کو اسی راہ پر لے چل جو ہمیشہ قائم رہے ٭

۱۰۔ مخالفت

دشمنی اور عداوت۔ حسد اور رنجش اور ناراضی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو خود اُسی شخص میں کمینہ عادتیں اور ذلیل اخلاق[۱] پیدا کرتا ہے اور بعوض اس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچاوے خود اپنا آپ نقصان کرتا ہے۔ اس انسانی جذبہ کو ہم مخالفت کہتے ہیں ٭

دشمنی اور عداوت کا منشا اکثر اتلاف حقوق[۲] کے سبب سے ہوتا ہے۔ زن[۳] یا زر[۴] و زمین یا خون اُس جذبہ کے جوش میں آنے کے باعث ہوتے ہیں ٭

حسد کا منشا صرف وہ اوصاف حمیدہ[۵] ہوتے ہیں جو محسود[۶] میں ہیں اور حاسد اُن کا خواہاں ہے مگر وہ اس میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں ٭

رنجش اور ناراضی اکثر باہمی معاشرت[۷] میں خلل واقعہ ہونے سے ہوتی ہے

---

[۱] بُرے اخلاق ٭ [۲] حقوق کے ضائع ہو جانیکے سبب سے ٭ [۳] عورت ٭ [۴] روپیہ ٭ [۵] نیک اوصاف ٭ [۶] جس پر حسد کیا جائے ٭ [۷] باہمی میل جول ٭

مگر ان سب کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو بغیر ان سببوں کے جوش میں آتا ہے اس کا منشاء نہ زر و زمین کی دشمنی ہوتی ہے۔ اور نہ مخالف کے اوصاف حمیدہ کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ یہ شخص اپنے مخالف کے اوصاف حمیدہ کو اوصاف حمیدہ ہی نہیں تصور کرتا اور نہ باہمی معاشرت کا خلل اس کا باعث ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر ان دونوں میں ملاقات اور واقفیت بھی نہیں ہوتی بلکہ اس کا منشاء صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخالفت رائے یا عقل و سمجھ دوسرے فریق کی رائے اور سمجھ سے مخالف ہوتی ہے ؛

یہ جذبۂ مخالفت قریباً کل انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر مہذب اور تربیت یافتہ اور نیکدل آدمیوں میں اس کا ظہور اور طرح پر ہوتا ہے اور نامہذب اور ناتربیت یافتہ آدمیوں میں اس کا ظہور دوسری طرح پر ہوتا ہے۔ پہلا اس مخالفت سے ہر قسم کے فائدے اُٹھاتا ہے اور دوسرا اُن فائدوں سے بھی محروم رہتا ہے اور دنیا میں خود اپنے تئیں بدطینت[1] اور کذاب[2] اور نامہذب ثابت کرتا ہے ؛

دنیا میں یہ بات قریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو متفق ہو جاویں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اُس کو چُن لوں اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے[3] ہوتا ہے

---

[1] بد فطرت۔ بُرا ؛ [2] جھوٹا ؛ [3] اپنے دشمن کی غلطیوں کے درست کرنے کی کوشش کرنا ہے ؛

اور اُن غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دلسوز[1] دوست بتاتا ہے کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لئے نہایت دلچسپ ظرافت[2] بھی کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ[3] بھی بول اٹھتا ہے اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے:

کمینہ طبیعت اور نامہذب ناشائستہ[4] آدمی یہ رستہ نہیں چلتا وہ بات کے حسن و قبح[5] کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے مخالف کے عیوب[6] ذاتی پر بحث کرنے لگتا ہے سخت کلامی و زشت گوئی[7] سب و شتم[8] اپنا پیشہ کر لیتا ہے اپنے مخالف کے عیوب اصلی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ ہر قسم کے بہتان[9] اس پر لگاتا ہے اور جھوٹی جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود مورد وَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكَاذِبِيۡنَ[10] بنتا ہے۔ اس راہ چلنے سے اور جھوٹ اتہام[11] کرنے سے اور لعنت خدا کا مورد[12] بننے سے اس کا مطلب اپنے مخالف کو بدنام کرنا اور عام لوگوں میں جو اس کے مخالف کے حال سے واقف نہیں ہیں ناراضی پیدا کرنا ہوتا ہے مگر درحقیقت اسکا یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا اور بعوض[13] اس کے کہ اس کا مخالف بدنام ہو وہ خود ہی زیادہ رسوا اور بدنام ہوتا ہے اس لئے کہ جب اُس مخالف کی برائی جو اس نے براہ کذب و اتہام[14] اس کی نسبت منسوب کی مشہور ہوتی ہے تو کوئی تو اُس کو

---

[1] ہمدرد دوست: [2] خوش طبعی: [3] چٹکلا۔ خوش طبعی ۔ مسخری:
[4] نالائق: [5] نیکی برائی: [6] جمع عیب: [7] بد کلامی:
[8] گالی گلوچ: [9] جھوٹے الزامات: [10] جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے
[11] تہمت لگانے سے: [12] سبب بنتا ہے: [13] اس کے بدلہ میں [14] جھوٹ و تہمت:

سچ سمجھتا ہے ملور بہت لوگ اس کی تحقیق[1] کے درپے ہونے اور جب اُس
کی کچھ اصل نہیں پاتے تو بعوض اس کے مخالف کے خود اسی کذّاب[2] پر
لعنت اور ٹھٹھوہ ٹھٹھوہ کرتے ہیں اور بقول شخصے کہ دروغ کو فروغ[3] نہیں ہوتا
تھوڑے ہی دنوں میں اس کی قلعی[4] کھل جاتی ہے۔ اور وہ جھوٹا بدگو خود
اُسی گڑھے میں گرتا ہے جو اس نے اپنے مخالف کے لیے کھودا تھا۔ پس
انسان کو چاہیئے۔ کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی
نیکی اور نیکدلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔
ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔

ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہمارے مخالف اس پچھلے طریقہ پر ہم سے مخالفت
کرتے ہیں۔ ہم کو اپنی مخالفت کا یا اپنے پر اتہام کرنے کا یا اپنی بدنامی کا
کچھ اندیشہ نہیں ہے بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ انجام کو ہمارے
مخالف ہی رسوا و بدنام ہوتے ہیں اور دُنیا انہی کو دروغ گو[5] وکذّاب قرار دیتی ہے
اگر ان کو ہمارے حال پر رحم نہیں ہے تو خود ان کو اپنے حال پر رحم کرنا
چاہیئے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ[6]

۱۱۔ خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں اُن میں سب سے زیادہ مہلک[7] خوشامد کا

---

[1] اس کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ [2] جھوٹا۔ [3] جھوٹ کبھی نہیں پھلتا۔
[4] بھید فاش ہو جاتا ہے۔ [5] جھوٹ بولنے والا۔ [6] اے پروردگار
قبول کر اسے ہم سے کیونکہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ [7] ہلاک کرنیوالی۔ خطرناک

اچھا لگتا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو دبائی ہوا[1] کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے۔ تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے ؏

اوّل اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبّت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے۔ اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے۔ کہ اُن خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی ایسی قدر کرتے ہیں جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے۔ اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی اور وہ مکرو

---

[1] ہوائے فاسد ؏

فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے +

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور[1] ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو ایسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بنا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اُس کمینہ شوق کے اِس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں۔ مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدنما[2] ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جائیں کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چُست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر +

خودی[3] جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اُس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر

---

[1] خیال کیا جائے گا + [2] بدنما + [3] خود پسندی۔ تکبر۔ غرور +

یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہئے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے۔ اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ اُن اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود اُن شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اُس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وُہ نہایت بڑے اُستاد مصوّر کی مانند ہو کہ وُہ اصل صورت اور رنگ اور خال خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو ؁

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وُہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں ؁

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔ مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وُہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ہر ایک تیز بُو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض[1] آدمی کو بدنامی اور نیکنامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمّت[2] طبیعت کو مناسب عزّت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے۔ جیسے کہ غفلت

---

[1] سخی ؁ [2] بلند ہمت ؁

اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں۔
انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرما میٹر میں وہی حصّہ
موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اُوپر ہوتا ہے ؛

۱۲۔ گذرا ہُوا زمانہ

برس کی آخیر رات کو ایک بُڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔
رات بھی ڈراؤنی اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی
ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا
نہایت غمگین ہے۔ مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ
اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات
پر وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا
ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے مُنہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے ہیں ؛
پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا
ہے۔ جبکہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی
کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ۔ بھائی بہن
اُس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں
کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اسکو
اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا۔ اور بے اختیار
چلا اُٹھتا تھا "ہائے وقت ہائے وقت۔ ہائے گذرے ہوئے زمانے۔
افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا ؛
پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ۔ سڈول ڈیل

بھرا بھرا بدن۔ رسیلی آنکھیں۔ موتی کی لڑی سے دانت۔ امنگ[1] میں بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی۔ اُس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا۔ کہ آہ ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ اُس کو یاد آتا تھا۔ اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا۔ اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گذر گیا۔ آہ وقت گذر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ۔ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے ؛

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی دیکھا۔ کہ رات ویسی ہی ڈراونی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اُڑتے ہیں۔ اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا۔ "ہائے ہائے میری گذری ہوئی زندگی بھی ایسی ڈراونی ہے جیسی یہ رات" یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا ؛

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن۔ دوست آشنا یاد آئے جنکی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گذر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے یہ کہتے تھے۔ بھائی بہن

---

[1] خواہشات سے بھرا ہوا ؛

دانتوں میں انگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں ؛

ایسی حالت میں اُس کو اپنی وُہ باتیں یاد آتی تھیں۔ جو اس نے نہایت بے پرواہی اور بے مروّتی[1] اور کج خلقی[2] سے اپنے ماں بھائی بہن دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروّت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اُس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا۔ اور یہ کہہ کر چلّا اُٹھتا تھا۔ کہ ہائے وقت نکل گیا۔ ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیونکر اس کا بدل ہو ؛

وُہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا ہوا کھڑکی تک پہنچا۔ اُس کو کھولا۔ اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے۔ اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا ؛

اتنے میں اس کو ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وُہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن[3]۔ نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اُس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وُہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وُہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی۔ حج کرنا۔ زکوٰۃ دینی۔ بھوکوں کو کھلانا۔ مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی۔ اپنے پیروں کو جن سے بیعت[4] کی

---

[1] بے مہری ؛ [2] بد اخلاقی ؛ [3] خوبصورتی ؛ [4] مرید ہونا۔ شاگرد بننا ؛

تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجد ٹوٹ کر یا تو کھنڈ رہیں اور پھر ویسے ہی جنگل ہیں کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے اُس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی[1] چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اُٹھا۔ ہائے وقت میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا ؎

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا۔ کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں ان کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کیلئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا۔ کہ یکایک اُس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا۔ وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولی۔ کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اُس نے پوچھا۔ کہ تمہاری تسخیر[2] کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے۔ نہایت آسان۔ پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی[3] کی طرح جس نے کہا

---

[1] فنا ہو جانے والی ؎ [2] مسخر کرنا۔ قبضہ میں لانا ؎ [3] گنوار۔ جنگلی۔ عام طور پر عرب کے جنگلی اور دیہاتی لوگوں کو کہتے ہیں ؎

کہ وَاللهِ لَا ازید و لا انقص" ادا کر کہ انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری
میں سعی[1] کرے۔ اُس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دُنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے
والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخیر تک رہیگا۔ پس جو بھلائی کہ انسان
کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل آخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز
روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں
کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں[3] بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان
کی بھلائی آخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی رُوح ہوں۔ جو
مجھ کو تسخیر کرنا چاہے۔ انسان کی بھلائی میں کوشش[4] کرے۔ کم سے کم اپنی
اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن
غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا :

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا۔ اور دیکھا کہ اُس نے اپنی بچپن
برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی
کا نہیں کیا تھا۔ اُس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام
جو کئے تھے۔ ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے
تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا :

اپنا حال سوچ کر وہ اُس دلفریب[5] دلہن کے ملنے سے مایوس ہُوا۔ اپنا
آخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ اُمید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی
حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا۔ ہائے وقت۔ ہائے وقت۔ کیا پھر تجھے

---

[1] قسم خدا کی نہ تو میں بڑھاؤنگا اور نہ گھٹاؤنگا : [2] کوشش کرے :
[3] اشیا منسوب بہ مادہ : [4] کوشش کرنیوالا : [5] خوبصورت۔ دل لبھانیوالی :

میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دینار یں دیتا۔ اگر پھر وقت آتا اور میں جوان ہو سکتا۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس کھڑی ہوئی۔ اس کو گلے لگا کر اس کی بلائیں لیں اس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا۔ کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے کیوں تو بیقرار ہے۔ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔ اُٹھ مُنہ ہاتھ دھو کپڑے پہن۔ نوروز[1] کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا۔ کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ خواب میں بُڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اُس نے سنکر اس کا جواب دیا۔ کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اُس پشیمان بوڑھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وُہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا۔ کہ دُو یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا۔ اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا۔ او خدا تو میری مدد کر۔ آمین۔

بس اے میرے پیارے نوجوان ہموطنو! اور اے میری قوم کے بچو! اپنی

---

[1] ایرانی کیلنڈر کے نئے سال کا پہلا دن یعنی موسم بہار کا آغاز ماہ فروردین کا پہلا روز جس روز کہ آفتاب نقطہ حمل پر آتا ہے۔ مطابق ۲۱ مارچ سال عیسوی یہ دن درحقیقت ایرانیوں کیلئے نہائت خوشی کا دن ہوتا ہے۔ اور اسے عید نوروز کہتے ہیں۔

قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ آخیر وقت میں اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو آخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین ؛

۱۳۔ بحث و تکرار

جب کُتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہیں۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں۔ اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ مُنہ سے جھاگ نکل پڑتی ہے اور عنیف[1] آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اس کی کمر میں اس کا کان اس کے مُنہ میں اور اس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں اُس نے اس کو کاٹا۔ اور اس نے اس کو بچھاڑ کر بھنبوڑا جو کمزور ہوا۔ دُم دبا کر بھاگ نکلا ؛

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے سو[illegible]

---

[1] سخت اور درشت آواز کے ساتھ ؛

نہیں یوں ہے - وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو وہ بولتا ہے تم کیا جانو - دونوں
کی نگاہ بدل جاتی ہے - تیوری چڑھ جاتی ہے - رُخ بدل جاتا ہے -
آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں - باچھیں چر جاتی ہیں - دانت نکل پڑتے ہیں
تھوک اڑنے لگتا ہے - باچھوں تک کف بھر آتے ہیں - سانس جلدی چلنا
ہے - رگیں تن جاتی ہیں - آنکھ - ناک - بھوں - ہاتھ عجیب عجیب
حرکتیں کرنے لگتے ہیں - غیف غیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں - آستین
چڑھا - ہاتھ پھیلا اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اس
کی مٹھی میں لپا ڈگی ہونے لگتی ہے - کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا - تو
غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر - اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے
والا نہ ہوا - تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی ؛

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی
ہے - کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے - کہیں توں تکار تک نوبت آجاتی ہے
کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے
پر ہی خیر گذر جاتی ہے - مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا
اثر پایا جاتا ہے لیکن انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں
کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے ؛

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کیلئے

۱؎ سخت و درشت ؛ ۲؎ ہاتھا پائی ؛ ۳؎ شور کرتے ہوئے چیختے چلاتے
(Roaring) ۴؎ سر پر ہاتھ ملتے ہوئے ؛ ۵؎ دھمکی آمیز تکرار ؛

بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب اور شائستگی۔ محبت اور دوستی کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید[1] کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دُو بدُو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ۔ لہجہ۔ آواز۔ وضع۔ لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو مگر بناوٹ بھی نہ پائی جائے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت[2] کے لفظ استعمال کرو مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یا شاید مجھے دھوکا ہوا یا میں غلط سمجھا۔ گو بات تو عجیب ہے۔ مگر آپ کے فرمانے سے باور[3] کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا اُلٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اُس دو تین دفعہ کی اُلٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت[4] نہیں آئی ہے۔ اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس اُلٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔ کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

---

[1] رد کرنا۔ [2] عذر خواہی۔ [3] اعتبار کرتا ہوں۔ یقین کرتا ہوں۔ [4] دشمنی۔ میل۔

جبکہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو مت آنے دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگتی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی۔ مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ میرے ہموطن اس بات پر غور کریں کہ اُنکی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے ؎

۱۴۔ اُمیّد کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک[1]۔ اے آسمان کے تارے تمہاری خوشنما چمک۔ اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والے دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالیشان درختو۔ اے اُونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو۔ تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو۔ اس لئے کہ ہم سے بہت دُور رہو۔ اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ۔ ہماری آنکھ کو بھایا ہے تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے ؎

وہ چیز کیا ہے۔ کیا عقل ہے جس کو سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں کیا وہ ہم

---

[1] قوس و قزح (Rain bow) ؎

کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں - اس کا میدان
تو نہایت تنگ ہے - بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی
ہے جو سب کے سامنے ہے ؛

او نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی - اُمید رب
خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے - تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم
کو تسلی دیتی ہے تو ہی ہمارے آڑے[1] وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے تیری
ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں
تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں -
تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ[2] خیال جاگتے ہیں تیری ہی برکت سے
خوشی - خوشی کے لئے نام آوری - نام آوری کے لئے بہادری - بہادری کیلئے
فیاضی - فیاضی کے لئے محبت - محبت کے لئے نیکی - نیکی کیلئے تیار ہے
انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں ؛
وہ پہلا[3] گنہگار انسان جب شیطان کے جنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے
اُس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی
تو ہی نے اس نا اُمید کو نا اُمید ہونے نہیں دیا - تو ہی نے اس مصیبت میں پھنسے
دل کو مرنے نہیں دیا - تو ہی نے اس کو اُس ذلت سے نکالا - اور پھر اسی
کو اعلیٰ درجہ پر پہنچایا جہاں کہ فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا تھا ؛
اس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت

---

[1] مصیبت اور مشکل کے وقت میں ؛ [2] سوئے ہوئے ؛ [3] آدم علیہ السلام مراد
ہیں - جو شیطان کے فریب کی وجہ سے باغ عدن سے نکلنے پر مجبور رہ گئے ؛

اُٹھائی اور مار پیٹ سہی۔ تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا[1] جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے ؛

اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامید دلوں کی تسلی امید تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے تجھی ہی سے ہر ایک رنج میں[2] آسودگی ہے عقل کے رستان جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈھتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا خوش الحان[3] جانوروں کے راگ بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں ؛

دیکھ۔ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول

---

[1] نوح علیہ السلام مراد ہیں ؛ [2] ہر تکلیف میں آرام ؛ [3] خوش آواز ؛

تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پائے۔ تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سورہ میرے بچّے سورہ۔ میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچّے سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت۔ تیری لیاقت تیری محبت جو تو ہم سے کریگا۔ آخر کار ہمارے دل کو تسلّی دینگے۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا[1] ہوگی۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کرینگی۔ تیری آواز ہمارے لئے خوش آیند[2] راگنیاں ہونگی۔ سورہ میرے بچّے سورہ۔ اے ہماری امیدوں کے پودے سورہ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاویں گے تو تم کیا کرو گے تم ہماری بے جان لاش پاس کھڑے ہو گے۔ تم پوچھو گے اور ہم کچھ نہ بولیں گے تم روو گے اور ہم کچھ رحم نہ کرینگے۔ اے میرے پیارے رونے والے۔ تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کرو گے۔ آہ ہم نہ ہونگے اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤ گے اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ۔ اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کرو گے آہ ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہوگے۔ سورہ میرے بچّے سورہ سورہ سورہ۔ میرے بالے سورہ ؛

یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اُس وقت تھیں۔ جبکہ بچّہ غوں غاں بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد[3] کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا۔ اُس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں

---

[1] روشنی۔ نور ؛ [2] مسرّت انگیز ؛ [3] خوش ؛

رہیں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی - آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہُوا - پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا - رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوُا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا - اور جبکہ وُہ تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر ہاتھ مُنہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل بے گناہ زبان سے بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو اُمید کی خوشیاں اور کسی قدر زیادہ ہوگئیں اس کے ماں باپ اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں - آہ ہماری پیاری اُمید تو ہی ہے جو مہد سے[1] لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے ؛

دیکھو وُہ بڈھا[2] آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے اُس کا پیارا[3] بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہوگیا ہے - وُہ اس کو ڈھونڈھتا ہے پر وہ نہیں ملتا - مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی - لہو بھرا دانتوں پھٹا کرتہ دیکھتا ہے پر ملنے سے نا امید نہیں - فاقوں سے خشک ہے غم سے زار زار ہے روتے روتے آنکھیں سفید[4] ہوگئی ہیں - کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر پھر ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے ؛

---

[1] گہوارہ سے قبر تک - بچپن سے موت تک ؛ [2] یعقوب علیہ السلام ؛ [3] مراد یوسف علیہ السلام جنہیں انکے سوتیلے بھائی شکار کے بہانہ سے جنگل میں لے گئے اور وہاں ایک کنوئیں میں ڈال دیا - اور باپ کے سامنے اُن کا لہو بھرا کرتہ جسے ایک بھیڑ کے لہو سے رنگین کیا گیا تھا - پیش کیا - اور کہا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے ؛ [4] بینائی جاتی رہی ہے ؛ [5] ملاقات ؛

دیکھ وہ بیگناہ[1] قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہ خانوں میں بند ہے اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے بے یار و دیار غیر قوم غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین کرتی ہے۔ قید خانہ کی مصیبت اس کی تنہائی۔ اس کا گھر اندھیرا۔ اور اس پر اپنی بیگناہی کا خیال اس کو نہائت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ مگر اپنی ہمیشہ زندہ رہنے والی امید تجھی میں اس کی خوشی ہے *

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں تقویت[2] تجھی سے ہے لڑائی کے میداں میں جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان[3] کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرات ہوتی ہے اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہائت بہادری سے بالکل بیخوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشین پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوتِ بازو اور اے بہادری کی ماں تیرے ہی سبب سے

---

[1] یوسف علیہ السلام مراد ہیں جو عزیز مصر کے حکم سے مصر میں قید کر دیئے گئے تھے *

[2] قوت۔ طاقت * [3] خاموشی * [4] دلیری *

فتح مندی کا خیال اُن کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمے کی آواز سُنتا ہے ؂

وُہ قومی بھلائی[1] کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دِن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈھتا ہے۔ اُس کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈھتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک ٹُٹی سی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو دشمن پاتا ہے شہری وحشی بناتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل[2] کفر کے فتوں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند۔ عزیز و اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں ؂

وُہ بھلا کس کی بات مانے ہیں　　بھائی سید[3] تو کچھ دیوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کر کر محنت اور دلسوزی[4] سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں۔ پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر۔ دل ہر وقت بیقرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ[5] خاطروں کی تقویت۔ تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے۔ تو ہی ہماری کٹھن منزلوں[6] کی ساتھی

---

[1] اس سے مراد خود سر سید احمد علیہ الرحمتہ ہیں ؂ [2] سر سید احمد خاں مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا پرچار کرتے تھے اور اُس زمانہ کے ناعاقبت اندیش علما ان کو اس وجہ سے اور کچھ بوجہ اختلاف عقائد کفر کے فتوے لگاتے تھے ؂ [3] سید سے مراد سر سید احمد خاں علیہ الرحمتہ ہیں [4] ہمدردی ؂ [5] ٹوٹے ہوئے دلوں کیلئے باعثِ قوت ؂ [6] مشکلات ؂

ہے۔ تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود[1] تک پہنچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہر مراد کو پاوینگے اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری "اُمید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ ؛

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید۔ جبکہ زندگی کا چراغ[2] ٹمٹماتا ہے۔ اور دنیاوی حیات کا آفتاب[3] لب بام ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی رنگ فق ہوجاتا ہے۔ منہ پر مردنی چھاتی ہے۔ ہوا ہوا میں پانی پانی میں مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے ؛

اُس وقت اُس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ملتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال[4] زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی امید ہوتی ہے ؛

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہوجاتا ہے۔ اُس لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دُنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے۔ اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے۔ گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے ؛

---

[1] مقصد ؛ [2] جب حیات انسانی خاتمہ کے قریب ہوتی ہے ؛ [3] انسان موت سے ہم آغوش ہونے کے قریب ہوتا ہے ؛ [4] ابدی زندگی ؛

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ جہاں سورج کی کرنوں اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچی تیمری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے ایمان کے توشۂ[1] اور امید کے ہادئی[2] اور موت کی سواری سے مگران سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام "امید" ہے ؛

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بردباری[3] سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت[4] سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔ ؎

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را ۔ دویدن رفتن استادن نشستن خفتن مردن

۱۵ ۔ سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے ؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے ؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت[5] میں اس کو پیدا کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں ؟ کیا یہ کوئی اصطلاح

---

[1] سامان سفر ؛ [2] ہدایت دینے والا ؛ [3] تحمل ؛ [4] خوشی مسرت ؛ [5] پیدائش ؛ [6] محاورہ۔ کسی لفظ کے اصلی معنوں سے ملتے جلتے کچھ اور معنی رواج پا جاتے ہیں انہیں اصطلاح کہتے ہیں ؛

ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں[1] نے مقرر کیا ہے ہمیا یہ ایسی چیز ہے کہ
اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت
میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کیلئے انسان کے حالات پر ہم کو
نظر کرنی چاہیئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے تو وحشیوں
میں شہریوں میں سب میں اس کا نشان ملیگا۔ گو اس کی صورتیں مختلف
دکھائی دیتی ہوں۔ الا سب کی جڑ ایک ہی ہو گی ؛

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وُہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز
کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے
اور کسی چیز کو بُرا اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اُس بُری
چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے جس کو وُہ اچھا سمجھتا ہے۔
یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسانوں کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں
پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ
نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے ؛

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونیکے
دو اصول ٹھہرے۔ اچھا اور بُرا۔ اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب
ٹھہری۔ مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب ملکی اور تمدنی[2]
ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں
کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے
اور داخل تہذیب جانتی ہے دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ

---

[1] فلسفہ دان۔ دانا ؛ [2] وہ اسباب جس کا تعلق کسی ملک اور اُس کے تمدن سے ہو ؛

حرکت قرار دیتی ہے - یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں میں ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا - یا بہت ہی کم ہوتا ہے جبکہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں - ان کی معلومات اور ان کے خیالات ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب میں یکساں پیدا ہوتے ہیں - اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں تو ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے ؛

ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بو و باش[1] سے تعلق رکھتی ہیں نہ فکر اور خیال اور دماغ سے اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے جس کے سبب سے وہ اچھا اور بُرا ٹھہرتا ہے اور جس سبب سے خواہش تبادلہ تحریک[2] میں آتی ہے اور تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے - پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے ؛ اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال کرونگا یعنی پسند اور ناپسند

---

[1] رہنے سہنے ؛ [2] حرکت میں آتی ہے ؛

انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل[1] ہے ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں جیسے کہ مزا یا مذاق۔ مگر وُہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ ان سے وُہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں سماتے۔ اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ "پسند" کرتا ہوں پس پسند کا صحیح ہونا جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع[2] ہے بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے ؎

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات پر اور علم طبیعات[3] سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی ایک وُہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودب[4] دل سے دیکھتے ہیں ؎

تہذیب یا یوں کہو کہ بری حالت سے اچھی حالت میں لانا۔ دُنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہو یا مادی یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش[5] حاصل کرنے کا سب کو یکساں[6] خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دنیا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر۔ یاقوت و الماس[7] سے نہایت

---

[1] استعمال ہوتا ہے ؎ [2] شاخ ؎ [3] منسوب بہ طبیعت نیز حکمت کی ایک قسم کا نام ہے جس میں مادہ کی بحث بہ ہیئتِ مجموعی کی جاتی ہے ؎ [4] ادب کرنیوالا ؎ [5] آرام ؎ [6] ایک جیسا ؎ [7] بیش بہا۔ قیمتی جواہر ؎

نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے۔ چاندی۔ مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالیشان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور اُن کے رہنے کے گھونپے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں رمعاشرت کی چیزیں تمدن کے قاعدے۔ عیش و عشرت کی مجلسیں خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعضی چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ ناتربیت یافتہ قوموں میں حسب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی[1] نے تربیت[2] یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت[3] یافتہ قوموں

---

[1] راگ کا علم۔ گانے کا علم ٭ [2] مہذب ٭ [3] غیر مہذب ٭

میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت اس کا گھٹاؤ اور لَے کا بڑھاؤ۔ اس کا ٹھہراؤ اور اس کی اونچ۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لَے اور تال۔ راگ راگنی کو جانتے ہیں[1] مگر دل کی لہر اُن کی لَے اور دل کی پھڑک اُن کا تال ہے۔ اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا طبعی حرکت کے ساتھ اُچھلنا مل کی بیتابی سے جھکنا۔ اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا گو نزاکت اور فن خنیا گری[1] سے خالی ہو مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں۔ اسی طرح اُس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں کہ ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع[2] یا ادنےٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے۔ اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی[3] اور جذبات نفسانی[4] کو اعتدال[5] پر رکھنا۔ وقت عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور معاملات[6] اور معاشرت[7] اور اخلاق تمدن اور علوم[8] و فنون[9] کو بقدر امکان[10] قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا

---

[1] فن موسیقی۔ راگ۔ گانا۔ [2] پھرنا۔ بازگشت۔ رغبت کرنا۔ [3] وہ افعال جنہیں انسان ارادتاً سرانجام دے۔ [4] جوش دل۔ خواہشات نفسانی۔ [5] حالت صحت۔ توسط۔ [6] لین دین باہمی۔ [7] آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنا۔ [8] جمع علم۔ [9] جمع فن۔ [10] جہاں تک ہو سکے

اور ان سب کو خوش اسلوبی[1] سے برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین[2] اور حقیقی وقار[3] اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے ؛

اس تہذیب کے حاصل ہونے کے بقول مسٹر ایچ۔ ٹی۔ بکل صاحب کے چار اصول ہیں :۔

اول :۔ جو چیزیں ہم کو دکھلائی دیتی ہیں اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا اور ان کے علوم کو پھیلانا ۔ پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اسی قدر انسانوں کی ترقی ہوگی ؛

دوم :۔ اس تحقیقات سے پہلے تجسس[4] کا خیال پیدا ہونا چاہیئے ۔ جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اُس کی اعانت[5] ہوتی ہے ؛

سوم ۔ جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں ۔ اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم ۔ مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقلی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں ۔ اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے ؛

چہارم :۔ اس تحریک کا بڑا دشمن جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے ۔ یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح

---

[1] بہتر طریق سے ؛ [2] حقیقی عزت اور دبدبہ ۔ مرتبہ ؛ [3] اصلی عزت ۔ سنجیدگی ۔ حلیمی ؛ [4] تلاش ؛ [5] مدد ؛

سلطنت اور مذہب سے نہ ہو۔ تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلاوے کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے اور مذہب یہ سکھلاوے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیئے ٭

"پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ بادشاہ وقت ہم کو بتادے کہ ہم کو کیا کیا کرنا چاہیئے۔ انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع[1] ہے اور جسقدر کہ ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیاء میں اور ٹرکی اور ایجپٹ میں بھی ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہے اور یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے۔ پس جب تک یہ خیال نہ آویگا۔ کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لئے کیا کرنا چاہیئے اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت نہ عزت ہوگی۔ نہ منزلت اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی۔ مگر دوسرا جملہ جو مذہب سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط۔ یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے۔ اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بیجا تعصبات[2] اور مسائل اجتہادیہ[3] اور عقائد قیاسیہ[4] اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً[5] اصلی احکام مذہبی ہیں اور ان میں کچھ تفرقہ[6] و تمیز نہ

---

[1] ایک زبردست رکاوٹ ٭ [2] غیر مناسب طرفداری - دشمنی ٭ [3] وہ مسائل جنہیں علما نے نہایت کوشش اور سوچ کے بعد نکالا ہو ٭ [4] وہ عقیدے جو موافق قیاس اور قاعدے کے ہوں ٭ [5] عملی اور اعتقادی طور پر ٭ [6] اختلاف ٭

رہے۔ جیسے کہ مذہب اسلام کی موجودہ حالت ہے اور جو تقلید[1] کی تاریکی میں آنکھوں سے بالکل چھپ گیا ہے تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا مثل مذہب غلط کے مانع قوی[2] ہے۔ إلّا سچا مذہب جیسا کہ ٹھیٹ[3] مذہب اسلام ہے۔ وہ کبھی ہارج[4] ترقی انسان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں ۔ وَالسَّلَامُ[5] عَلیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْھُدیٰ ۔

۱۶۔ اپنی مدد آپ

خُدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ[6] مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش۔ اُس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جب کہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اُس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنے آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے۔ اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت[7] جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے

---

[1] اسلامی نکتۂ خیال کے مطابق تقلید سے مراد مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کا مقلد ہونا ۔
[2] ایک زبردست رکاوٹ ۔ [3] مراد سیدھا اور صاف ۔ [4] رکاوٹ ۔ [5] سلام ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے ۔ [6] آزمایا ہوا قول ہے ۔ [7] شرم۔ حفظ ناموس کا جذبہ ۔

اور اسی کے ساتھ عزّت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جب کہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وُہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزّت ہو جاتی ہے۔ آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں۔ خواہ اپنی بھلائی[1] اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر بدیہی اور لابدی[2] ہے) کہ وُہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہم وطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزّت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وُہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کر اُن کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں ایک شخص فرض کرو کہ وُہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جاوے۔ قومی عزّت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتی ہے۔ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دیدینے سے گو وُہ کیسی ہی ایماندار[illegible] انصاف سے کیوں نہ دیا ہو۔ قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے

---

[1] ظاہر۔ جس کے لئے دلیل کی حاجت نہ ہو۔ [2] ضروری۔ ناچاری۔ ناگزیر ؎

بلکہ خود اُس کے چال چلن پر اُس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا - تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے - ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی - مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قوی کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے ؛

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت[1] اور معاون[2] ہونے کے زیادہ تر منفی[3] اور مانع[4] ہے اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے - جبکہ قانون کا عملدرآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ[5] اُٹھا سکتا ہے - جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے - مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ایصار نے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی - فضول خرچ[6] کو کفایت شعار[7] - شرابخور کو تائب[8] نہیں بنا سکتا - بلکہ یہ باتیں شخصی محنت کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں - قومی - ترقی - قومی عزت قومی اصلاح - عمدہ عادتوں - عمدہ چال چلن - عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے - نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرنے سے ؛

پُرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِم[9] اگر اس مقولہ میں

---

[1] ثابت کرنیوالا ۔ establishing, demonstrative, positive.

[2] مددگار ؛ [3] نفی - جس سے انکار لازم آئے - کم کرنے والا - negative,

[4] رکاوٹ ؛ [5] مزہ - فائدہ ؛ [6] فضول خرچی سے بچنے والا - سوچ سمجھ کر خرچ کرنیوالا ؛ [7] توبہ کرنیوالا - بچنے والا ؛ [8] اپنی خواہشات پر قابو حاصل کرنیوالے ؛

[9] رعایا اپنے حاکم کے مذہب پر ہوتی ہے ؛

"اَلنَّاسُ"۔ سے چند خاص آدمی مراد لئے جائیں جو بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں
تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی
ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔ رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی
جاتی بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سارنگ بدلتی جاتی ہے۔ نہایت ٹھیک بات ہے
کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے۔ جو
رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی
رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اس کو زبردستی
سے پیچھے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی
میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھنچ جاتی ہے
تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا
کہ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے
بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا۔
ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی
ہے۔ گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھنچتی بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ
کو پیچھے کھینچ لائی ہے۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے۔ یقینی
اُسی کے موافق اُس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے
جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسال[1] میں آجاتا ہے اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت

---

[1] وہ مقام جہاں سے پانی مختلف اطراف میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یا وہ جگہ
جہاں مسافروں کے لئے پانی مہیا کیا جائے۔

ہوتی ہے اور جاہل و خراب و نا تربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ[1] حکومت کرنی پڑتی ہے ؎

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے۔ کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدرو منزلت[2] بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اُس ملک کی رعایا کے چال چلن اخلاق و عادات تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت اُن مرد عورت و بچّوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وُہ قوم بنی ہے ؎

قومی ترقی مجموعہ ہے۔ شخصی عزّت۔ شخصی ایمانداری۔ شخصی ہمدردی کا اسی طرح قومی تنزل[3] مجموعہ ہے شخصی سستی شخصی بے ایمانی۔ شخصی بے عزّتی شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدّنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے۔ درحقیقت وُہ خود اُسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود[4] کردیں تو یہ بُرائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ شور سے پیدا ہو جاویں گی جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جاوے ؎

اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچّی ہمدردی اور سچّی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزّز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و

---

[1] غیر مہذب۔ (uncivilized, brutish) [2] عزت۔ بزرگی ؎
[3] قومی زوال۔ انحطاط ؎ [4] فنا کردیں ؎

تربیت کا۔ بات چیت کا۔ وضع ولباس کا۔ سیر سپاٹے کا شغل اشغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے۔ اُس سے اُن کی شخصی چال چلن۔ اخلاق وعادات نیکی وسچائی میں ترقی ہوسکتی ہے؟ حاشا[1] وکلا۔

جب کہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کرسکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح وترقی کرے کس قدر افسوس، بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے۔ یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بداخلاقی وخودغرضی جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خودغرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پرواہ ہے وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہوسکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر[2] ہے۔ اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح وترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ گو کیسی ہی تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں وہ تبدیلیاں فانوس[3] خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو

---

[1] ہرگز نہیں۔ استثنا وتردید کے لیے مستعمل ہے۔ [2] موتوف ہے۔
[3] وہ چراغ یا لمپ جس کے گرد گھومتی ہوئی تصاویر لگاتے ہیں۔

تو کچھ بھی نہیں ۔

مستقل اور مضبوط آزادی سچی عزت ۔ اصلی ترقی ۔ شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن معاشرت و تمدن کا محافظ[1] اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن[2] ہے ۔ جان اسٹیورٹ مل جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گذرا ہے ۔ اس کا قول ہے کہ ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی ۔ اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شے اُس کے لیے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے ۔ پھر اُس شے کو جس نام سے چاہو ۔ پکارو ۔" اُس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں ۔ کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ حکومت کیوں نہ قائم کی جاوے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اور اس اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا ہوں ۔ اے مسلمان بھائیو! کیا تمہاری یہی حالت نہیں ہے ؟ تم نے اس عمدہ گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے کیا فائدہ اٹھایا ہے ۔ تمہاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے ۔ ایچ ہیچ ہیچ ۔ اس کا سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے ۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر[3] ملے

---

[1] حفاظت کرنے والا ۔ [2] ذمہ دار ۔ کفیل ۔ [3] راہبر ۔ لیڈر ۔

گورنمنٹ فیاض[1] ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جائے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جائے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالہ اشرفی مل جو ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں۔ انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں ؂

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاوینگے اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو ؂

قومی انتظام یا عمدہ قوانین[2] کے اجرا[3] کی خواہش۔ یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈارگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دنگل گاہ میں کہا تھا جو ایک بڑا خیر خواہ آئرلینڈ کا تھا ؂

اُس نے کہا کہ جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے۔ کہ

---

[1] سخی ؂ [2] جمع قانون ۔ Law ; ؂ [3] جاری کرنا ؂

ہماری محنت ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آیندہ کی قوی توقع[1] اپنی بہتری کیلئے نہیں ہے استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جاویگی ‡

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں زمین کے جوتنے والوں کانوں کے کھودنے والوں۔ نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں مخفی[2] باتوں کو ڈھونڈھ کر نکالنے والوں۔ آلات جرثقیل[3] سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں۔ ہنرمندوں۔ شاعروں۔ حکیموں۔ فیلسوفوں۔ ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے! اور اس کو ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کی معمار ہیں لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی۔ ایک قسم کی ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائیداد

---

[1] مضبوط اُمید ‡ [2] پوشیدہ باتوں ‡ [3] بھاری اور وزن دار اشیاء کے اُٹھانے والے آلات ‡ [4] بنانے والے ‡

کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں[1] کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وُہ جائیداد ہم کو اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مارِ سرِ گنج[2] اسکی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آیندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جاویں مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے اُن پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بھی گرا دیا۔

انگریزوں کو جو دُنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی ہے اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ اُن کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے۔ اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی قوم کی طاقت کا سچّا پیمانہ رہا ہے۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے۔ اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اُس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدان کارزار[3] کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں۔ لیکن وُہ فتوحات[4] ان کو زیادہ انھی محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہے۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنیوالے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے شخص ہیں۔ جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں دیکھا لیکن تہذیب وشائستگی اور ترقی پر ان کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہُوا ہے

---

[1] بزرگوں۔ آباؤ اجداد۔ [2] اس سانپ کی طرح جو خزانہ پر بیٹھا ہوا ہو۔ [3] میدان جنگ۔ [4] جمع فتح۔

جیسا کہ اُن خوش نصیب مشہور ناموروں آدمیوں کا ہوا ہے۔ جن کی زندگی کے حالات مؤرخوں[1] نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں ؛

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر[2] دکھاتا ہے۔ اُس شخص کا اس زمانہ میں اور آیندہ زمانہ میں اُس کے مُلک اُس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے ؛

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی چال چلن ہیچ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسے و مدرستہ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کا نام جس کو انگریزی میں "لیف ایجوکیشن" کہتے ہیں۔ انسان پر قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرستہ العلوم کا علم طاق میں یا صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں گھر کے رہنے سہنے میں۔ شہر کی گلیوں میں پھرنے میں۔ صرافہ کی دوکان کرنے میں۔ ہل جوتنے میں کپڑا بُننے کے کارخانہ میں۔ کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا

---

[1] تاریخ لکھنے والے ؛ [2] مثال ؛

ہے اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کئے لوگوں میں صرف اُس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے ؛

یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے عمل چال چلن تعلیم نفسی۔ نفس کشی شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی۔ قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وُہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجہ کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے علم سے عمل نہیں آجاتا علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برترؔ[1] ہے اور مشاہدہؔ[2] آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کی نسبت عمل اور سوانح عمریؔ[3] کی نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے ؛

کیا یہی وجہ ہے جو مدرسۃ العلوم مسلمانان کے بانیوںؔ[4] نے یہ تجویز کی ہے۔ کہ مسلمانوں کے لڑکے گھروں سے اور بد صحبتوں سے علیحدہ مدرسۃ العلوم میں عالموں اور اشرافوں اور تربیت یافتہؔ[5] لوگوں کی صحبت میں رکھے جاویں ؟

---

[1] بلند درجہ رکھتا ہے ؛ [2] دیکھنا۔ نظر کرنا ؛ [3] وہ کتاب جو کسی کے حالات زندگی پر مشتمل ہو ؛ [4] بنا رکھنے والے۔ بنانے والے۔ [5] مہذب۔ تعلیم یافتہ ؛

۱۷ - سمجھ

یعنی تمیز جس سے بھلائی برائی میں امتیاز کیا جاتا ہے

میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسانوں کے دلوں کو چیر کر ان کا حال دیکھا جاوے تو دانا اور ناداں دونوں کے دلوں میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق نکلیگا دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بیہودہ خیال آتے ہیں بیشمار وسوسے دونوں کے دلوں میں اُٹھتے ہیں - مگر ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ دانا آدمی اُن میں سے انتخاب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کون سے خیالات ایسے ہیں جن کو گفتگو میں لانا چاہیئے اور کون سے ایسے ہیں جن کو چھوڑ دینا چاہیئے - نادان[1] آدمی ایسا نہیں کرتا - اور جو خیال اس کے دل میں آتا ہے بے سوچے سمجھے مُنہ سے بکتا جاتا ہے - دانشمند[2] آدمی بھی دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں نادان کی مانند ہوتا ہے جو اس کے دل میں آتا ہے - بے تردد[3] دوست سے کہتا ہے گویا اُس کے خیالات ہی ایک بلند آواز میں آتے ہیں ۔

پسٹلی صاحب کا یہ قول ہے کہ "انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیئے - کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے کہ اگر کبھی وُہ دشمن ہو جاوے تو اس کے ضرر[4] سے بچنے کی جگہ رہے - اس قول کی پہلی بات جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کی ہے وُہ نہایت عمدہ ہے - مگر پچھلی بات جو دوست کیساتھ برتاؤ کی ہے وُہ

---

[1] بے وقوف ۔ [2] عقلمند ۔ [3] بلاخوف ۔ [4] نقصان سے ۔

کچھ اچھی نہیں۔ اس میں سمجھ کی بات کچھ بھی نہیں ہے بلکہ نری مکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات کہہ نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے۔ بعض دفعہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انہی کو دغاباز اور برا کہتی ہے اور دوست پر بھروسہ کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتی۔ ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیئے ؛

سمجھ صرف باتوں ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی متعلق ہے اور گویا ہماری زندگی میں ہمارے تمام کاموں کی رہنما[1] اور ہمارے لئے ہمارے قادر مطلق خدا کی نائب[2] ہے۔ انسان میں بہت سی بڑی بڑی عمدہ عمدہ صفتیں ہیں مگر سمجھ سب سے زیادہ مفید ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے اور تمام صفتوں کی قدر ہوتی ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ تمام صفتیں اپنے اپنے موقع پر کام آتی ہیں۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ شخص جس میں وہ صفتیں ہیں ان صفتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سمجھ بغیر علم اور عقل دونوں ناچیز ہیں۔ بھلائی برائی دکھائی دیتی ہے۔ باوجودیکہ انسان میں نہایت عمدہ عمدہ خصلتیں ہوتی ہیں مگر سمجھ بغیر ان کے برتاؤ میں غلطیاں کرتا ہے اور نقصان پر نقصان اٹھاتا ہے۔ سمجھ ہونے سے صرف انہی خوبیوں کا جو اس میں ہیں مالک نہیں ہوتا بلکہ دوسروں میں جو خوبیاں ہیں اُن کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ سمجھدار آدمی جس سے گفتگو کرتا

---

[1] راستہ دکھانیوالی ؛ [2] نائم مقام — (Deputy.)

ہے اس کی لیاقت کو بھی جان لیتا ہے اور اسی کی لیاقت کے موافق گفتگو کرتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں اور جماعتوں کی مجلسوں کے حالات پر غور کریں۔ تو ہم کو صاف معلوم ہو گا کہ ہر ایک مجلس میں کسی عقلمند کی گفتگو کو غلبہ ہوتا ہے اور نہ کسی بہادر اور دلیر کی گفتگو کو بلکہ اسی شخص کی گفتگو سب پر غالب رہتی ہے جس کو سمجھ ہے اور جو اہل مجلس کی لیاقتوں اور جو بات کہنی ہے اور جو نہ کہنی ہے اس میں تمیز[1] کر سکتا ہے جس شخص کو بڑی سے بڑی لیاقت حاصل ہو مگر سمجھ نہ ہو وہ ایک نہایت قوی اور زبردست پر اندھے کی مانند ہے جو بسبب اندھے پن کے اپنے زور و قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا ہے۔ گو ایسے شخص کو دنیا میں اور سب طرح کے کمال حاصل ہوں مگر نہ ہو تو وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں۔ برخلاف اس کے اگر اسکی سمجھ پوری ہو اور صرف اسی ایک صفت میں اس کو کمال ہو اور باقی اوصاف متوسط[2] درجہ کے رکھتا ہو تو وہ اپنی زندگی میں جو کچھ چاہے کر سکتا ہے ؛

سمجھ جس طرح کہ انسان کے لئے بہت بڑا کمال ہے۔ اسی طرح مکر اس کے حق میں بہت بڑا وبال[3] ہے۔ نیکدل کی منتہائی[4] خوبی سمجھ ہے اور بددل کی منتہا[5] بدی مکر یا یوں کہو کہ وہ نیک دل کے لئے معراج[6] ہے اور یہ بددل کے لئے کمال۔ سمجھ نہایت عمدہ اور نیک مقصد پیدا کرتی ہے اور اُن کے حاصل ہونے کو نہایت عمدہ عمدہ اور تعریف کے قابل ذریعے قائم کرتی ہے مگر مکر میں صرف خودغرضی ہوتی ہے۔ سمجھ مثل ایک روشن آنکھ کے ہے۔

---

[1] امتیاز کر سکتا ہے۔ فرق کر سکتا ہے ؛ [2] درمیانہ درجہ کے ؛ [3] مصیبت ؛ [4] انتہائی ؛ [5] انتہا ؛ [6] عروج۔ ترقی۔ درجہ کی بلندی ؛

جس میں بے انتہا وسعت[1] ہے اور تمام دُنیا کو اور دور دور کی چیزوں کو بعض آسمانوں کو اور آسمانوں کے ستاروں کو بخوبی دیکھ سکتی ہے۔ مگر مثل ایک کوتاہ نظر[2] آنکھ کے ہے جو پاس پاس کی ناچیز چیزوں کو دیکھ سکتی ہے اور دور کی چیزیں گو وُہ کیسی ہی عمدہ اور روشن ہوں ایسے نظر نہیں آتیں۔ سمجھ جس قدر ظاہر ہوتی جاتی ہے اسی قدر انسان کا اختیار[3] اور اعتبار[4] بڑھتا جاتا ہے۔ مگر کاٹھ کی ہنڈیا کی مانند ہے کہ جب ایک دفعہ کھل گیا۔ تو پھر اس کی قوت اور عزت بالکل جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کسی کام کا نہیں رہتا جو کام کہ وہ ایسی حالت میں کر سکتا جب کہ لوگ اس کو ایک سیدھا سادہ بھولا بھالا آدمی سمجھتے۔ اب وہ کام بھی وہ نہیں کر سکتا۔ سمجھ عقل کے لئے کمال ہے اور ہمارے کاموں کے لئے رہنما۔ مگر ایک قوت ہے جو صرف حال ہی کے فائدوں کو دیکھتی ہے سمجھ نہایت عقلمند اور نیک آدمیوں میں پائی جاتی ہے۔ مگر اکثر جانوروں میں اور ان لوگوں میں جو جانوروں کی مانند یا ان سے کچھ بہتر ہوتے ہیں پایا جاتا ہے۔ سمجھ نفس الامر[5] میں ایک نہایت خوبصورت دلکش چیز ہے اور مکر گویا اس کی بگاڑی ہوئی نقل ہے۔ سمجھ والے آدمی کی طبیعت ہمیشہ زمانہ حال[6] اور استقبال[7] دونوں پر لگی رہتی ہے جو باتیں کہ زمانہ دراز کے بعد ہونے والی ہیں اور جو اب ہو رہی ہیں دونوں کو دیکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ رنج و خوشی جو دوسری زندگی یعنی قیامت میں ہونے والی ہے۔ وہ بیشک ہوگی۔ گو اس کا زمانہ ابھی بہت دور ہے وہ اس کے دور ہونے کے سبب سے اس لئے اس کو حقیر نہیں سمجھتا

---

[1] کشادگی۔ فراخی ؛ [2] وہ آنکھ جو دُور کی اشیا کو نہ دیکھ سکے ؛ [3] طاقت ؛ [4] عزت ؛ [5] حقیقت میں ؛ [6] موجودہ زمانہ ؛ [7] زمانہ آئندہ ؛

کہ دوسری زندگی یعنی قیامت کی تکلیف وراحت[1] لمحہ لمحہ پاس آتی جاتی ہے۔ اور اسی طرح سے رنج وخوشی دیویں گی ۔ جیسے کہ زمانہ حال میں رنج وخوشی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ نہایت غور وفکر سے ان خوشیوں کے ہاتھ آنے کیلئے کوشش کرتا ہے جو قدرت نے اس کے لئے بنائی ہیں ۔ اور جن کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے خیال کو ہر کام کے انجام[2] تک دوڑاتا ہے اور اس کے حال[3] مآل[4] کے نتیجوں پر غور کرتا ہے اور اس فانی دُنیا کے تھوڑے سے نفع اور فائدہ کو اگر درحقیقت وہ نفع اور فائدہ اس کی سچی عاقبت کے خیال کے مخالف ہو چھوڑ دیتا ہے ۔ غرضیکہ اس کی تمام تدبیریں عمدہ ہوتی ہیں اس کا رویہ ایسے شخص کی مانند ہوتا ہے جو اپنا فائدہ بھی سمجھتا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا مناسب طریقہ بھی جانتا ہے سمجھ جس کو میں نے اس مضمون میں بطور ایک نیکی اور کمال کے بیان کیا ہے وہ صرف دنیا ہی کے کاموں کیلئے مفید نہیں بلکہ ہماری ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لئے بھی فائدہ مند ہے وہ صرف اس فانی انسان کے لئے ہی رہنما نہیں ہے بلکہ اس اصلی نا فانی انسان کے لئے بھی جو ہم میں بولتا ہے رہنما ہے بعض مصنف اسی کو عقل کہتے ہیں اور بعض سمجھ یعنی تمیز جس سے اچھی یا بُری اور بھلائی وبرائی میں امتیاز[5] کیا جاتا ہے ۔ حقیقت میں یہی چیز سب سے بڑی ہے ۔ اس کے فائدے بے انتہا ہیں اور پھر اس کا ہاتھ نہایت ہی آسان ہے ۔

ایک مصنف کا قول ہے کہ سمجھ ہی ایسی رونق کی چیز ہے جس کو کبھی زوال نہیں جو اس کو چاہتے ہیں آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں جو اس کو

---

[1] آرام ۔ [2] نتیجہ تک ۔ انتہا تک ۔ [3] موجودہ ۔ [4] نتیجہ ۔ [5] فرق کیا جاتا ہے ۔

ڈھونڈھتے ہیں وُہ آسانی سے پاتے ہیں اس کی تلاش میں ان کو بہت دُور جانا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ اس کو اپنے ہی دروازے پر پاتے ہیں۔ اس کا خیال رکھنا ہی اس میں کمال حاصل کرنا ہے۔ جو کوئی اس پر خیال رکھتا ہے اُسی دم جستجو سے چھوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ وُہ خود ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہے اور جو اس کے لائق ہیں ان کو رستہ ہی میں ملتی ہے اور پھر کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی ؞

افسوس کہ ہماری قوم میں سب کچھ ہے پر یہی نہیں۔

۱۸۔ اختتام سال ۱۲۹۱ھ و شروع سال ۱۲۹۲ھ

سوا چار برس بخریت گذر گئے۔ اب پھر نیا سال شروع ہوا۔ گذشتہ برسوں میں جو کچھ ہنگامے ہونے تھے ہوئے۔ اب دُم باقی رہ گئی ہے چاندی بڑھیا کی کہانی ہے کہ ہاتھی نکل گیا پر دُم باقی ہے۔ آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں تو بھی بجا ہے اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فصل بہار کی آمد کی خوشیاں منائیں تو بھی زیبا ہے۔ جو کچھ اس سوا چار برس میں ہُوا۔ کیا ایسے قلیل[1] زمانہ میں اُس کے ہونے کی ہم کو توقع[2] تھی۔ توبہ۔ کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں سے اپنی قوم کے جگانے اور اُٹھانے کی جو مدت دراز سے غفلت کے تاریک[3] گڑھے میں پڑی ہوئی بے خبر سو رہی تھی توقع تھی۔ استغفر اللہ[4]

وُہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۲۸۰ھ نبوی اور ۱۲۸۷ھ جبکہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا۔ امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جاویگا۔

---

[1] تھوڑے زمانہ میں ؞ [2] امید تھی ؞ [3] اندھیرے ؞ [4] بخشش طلب کرتے ہیں حق تعالےٰ سے

ہماری قوم کی جو کچھ بد اقبالی[1] تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ جانتے تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کی دارو نے بیہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کو پتھرا[2] دیا تھا۔ دل پتھر ہو گئے تھے۔ دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سست ہو گئے تھے۔ زندہ تھے پر مُردوں سے بدتر تھے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تھے پر کچھ نہ کرتے تھے۔ اسی تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔ کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے۔ لبوں پر جان ہے۔ پھر اگر جان نہیں تو جہان نہیں۔ کچھ لوگ ہوشیار ہوئے پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں ٭

بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑ[3] جما ہوا ہے۔ کچھ کھلتی ہیں مگر روشنی سے چندھیا[4] جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں۔ کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ چُپ۔ پھر جھنجوڑو[5] تو ہاں۔ اچھا کہہ کر دوسری کروٹ لیتے ہیں اور غافل[6] ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ ہوشیار ہوئے ہیں مگر بدمزاجی اور تند خوئی سے ضد میں آ کر کمل تانے پڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں اُٹھنے کے۔ تمہارا کیا چارہ ہے ہم یوں ہی پڑے رہینگے

---

[1] بدنصیبی ٭ [2] بینائی کا جاتے رہنا ٭ [3] آنکھ کا کیچڑ۔ (matter in the eye) ٭ [4] (To be dazzled by excess of light)
[5] ہلاؤ۔ حرکت دو ٭ [6] بے خبر ٭

بعضے اُن میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے رہو مت اُٹھو سید احمد[1] کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے ہم اسی بات کو سنکر خوش ہوتے ہیں اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اُٹھے۔ وہ کلبلائے[2]۔ خدا نے چاہا تو اب سمجھ دار بھی ہو جائیں گے۔ یہی رست[3] وخیز ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے پتھر پسیجا[4] تو سہی۔ اب کسی نہ کسی طرف بہ نکلیگا۔ لوہا پگلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہیگا۔ بند پانی سے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہیئے پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنا لیگا۔ اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت اچھی نہیں۔ قوم کے لیئے کچھ کرنا چاہیئے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے۔ رسولزیشن جس کے نام سے لوگوں کو نفرت تھی سکیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچہ میں نہیں ہے۔ کیا نیچر کا قافیہ[5] کیچر کہتے ہوئے اب لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے (معاف کیجیئے ان ٹھنڈی سونے والوں کا ذکر نہیں ہے) کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے۔ کیا چار دانگ ہندوستان کے اخباروں میں تہذیب رسولزیشن رسولزیشن قومی ہمدردی۔ قومی ہمدردی۔ پیٹریاٹزم[6] پیٹریاٹزم کا غلغلہ نہیں ہے۔ کوئی اخبار اُٹھا دیکھو۔ ان میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل

---

[1] سر سید احمد خاں ؛ [2] بیقرار ہونا۔ (Agitated.)

[3] قیامت۔ حشر۔ ہنگامہ آرائی ؛ [4] پگھلنا۔ (Melting.)

[5] جو حرکات و حروف معین نظم میں ہر شعر کے آخر میں آئیں۔

[6] حب الوطن۔ وطن دوستی؛

دیکھ لو۔جس گلی کوچہ میں جاؤ۔ سیّد احمد کے تہذیب الاخلاق کا جھگڑا اُس کو مکہ میں جاؤ تو سیّد احمد کو پاؤ۔ مدینہ میں جاؤ تو سیّد احمد کو پاؤ۔ بُرا کہو خواہ بھلا کہو۔ مگر ہم دعا گوؤں کو مت بھولو ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ ولولہ اور غلغلہ اور ہر ایک بات کا چرچا دراصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ کہ کسی کی کیا لئے ہے اور کسی کی کیا۔ کیونکہ جو بات ٹھیک نہیں ہے۔ وُہ آج نہیں کل یکل نہیں پرسوں سب کو معلوم ہو جاویگی اور سب اسی پر یقین کرینگے۔ اور اسی پر متفق[1] ہوں گے۔ ضرور ایک دن وُہ آویگا۔ جو قوم کہے گی کہ ہاں سیّد بھی کوئی دیوانہ تھا۔ پر بات ٹھکانے کی کہتا تھا۔ اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہو اور در حقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آگئی ہو تو ہمارے اس ناچیز پرچہ نے اپنا کام پورا کر لیا۔ اور اس کی مراد پوری ہوگئی۔ والحمد اللہ[2] علی ذلک ٭

مگر ہمارے بعض محب وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں۔ کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی سولائزڈ یعنی مہذب و ترتیب یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق[3] سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ جب اُس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں۔ تو ہماری قوم کو کیوں بُرا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہئے۔ کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی

---

[1] اتفاق کرینگے ٭ [3] دھوم دھام۔ (Show; pomp ;)
[2] اس بخشش پر خدا کی تعریف ہو ٭

پھلی[1] کو نو کیں۔ تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ[2] نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ
کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہیئے۔ دوسرے کی آنکھ میں پھلی ہو یا نہ ہو۔ با اینہمہ[3]
وہ لوگ اس بات میں ذرا انصافانہ بھی نظر نہیں کرتے۔ قوم کی محبت انصاف
کو چھپا دیتی ہے۔ جس قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت[4]
کرتے ہیں۔ اس وقت اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں
کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں
اصلی محبّت اور سچّی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے نقصانوں کو دیکھے
اور ان کے مٹانے کی فکر کرے جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے
اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع[5] کرتے ہیں۔ ان کا دل اپنی قوم
کی حالت پر بہ نسبت اُن کے جو قوم کی طرفداری کرتے ہیں۔ ان کے عیبوں
کو چھپاتے ہیں۔ بہت زیادہ جلتا ہے اور حقیقت میں وہی لوگ محبِّ
وطن و محبِّ قوم ہیں وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ
(یہ خدا کی مہربانی ہے جسکو وہ چاہتا ہے دیتا ہے۔)

۱۹۔ آخری پرچہ

تہذیب الاخلاق

سوتوں کو جھنجوڑتے[6] ہیں۔ تاکہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب
پورا ہو گیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے اور کچھ جھنجلائے ادھر
ہاتھ جھٹک دیا۔ اُدھر پیر پھینک دیا اور جھنجلاہٹ میں اینڈے پڑے

---

[1] a white speck in the eye. [2] (آنکھ کا پھولا) موتیا بند cataract) [3] باوجود ان سب باتوں کے ÷ [4] اعتراض کرنا ÷ [5] اطلاع دیتے ہیں۔ واقف کرتے ہیں ÷ [6] پکڑ کر خوب ہلانا ÷

رہے تو بھی توقع ہوئی۔ کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شائد ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ چھیڑنا نہ چاہیئے اور تہذیب الاخلاق کو بند کر کر دور سے نیند کے اُن خمار آلودوں کا جواب صرف جھنجھلاہٹ سے اینڈے پڑے ہیں۔ اُٹھنا اور ہوشیار ہونا دیکھنا چاہیئے۔ بچے اٹھانے وقت کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاوگے تو ہم اور پڑے رہیں گے۔ تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اُٹھ کھڑے ہونگے۔ بچہ کڑوی دوا پینے وقت بسورکر[1] ماں سے کہتا ہے کہ بی یہ مت کہے جاؤ۔ کہ شاباش بیٹا پی لے۔ پی لے۔ تم چپ ہو رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو بھائیو۔ اب ہم بھی نہیں کہتے۔ کہ اُٹھو اٹھو پی لو۔ پی لو۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے کو ناصح[2] مشفق سمجھتا ہوں۔ بلکہ جو ہٹ[3] اور جو حالت ہماری قوم کی ہے اس کو جتلانا چاہتا ہوں ایک دن تھے۔ کہ ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے۔ کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ اب ہماری یہ مثل ہے ؎

لو آج میکش[4] مسجدِ جامع کے ہیں امام
داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

کیا کیا خیالات ہماری قوم میں ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کیسی کیسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر نہ تھیں۔ جب رند[5] تھے۔ تو

---

[1] To put on a crying face - رونی صورت بنانا ؛

[2] ہمارو نصیحت کرنے والا ؛ [3] ضد ؛ [4] اوباش - Profligate

فرہاد[1] سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جب صوفی تھے تو رومی[2] سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار تم کو کس نے جگایا؟ دل اور زمانہ نے۔ دل کی گھڑت ایسی تھی جس میں ہمیشہ غمخواری تھی۔ پر سوتا تھا۔ زمانہ نے جھٹکا دیا اور جگا دیا دفعتہً دیکھا۔ کہ دنیا اُلٹ گئی اور رنگ برنگ کی پھلواری سب اُجڑ گئی قوم کی حالت وہ دیکھی۔ کہ خدا کسی کو نہ دکھلائے۔ اسلام کی وہ صورت پائی کہ خدا کرے کافر بھی نہ پائے۔ اس بربادی کے سبب کا غیر قوم کو تو اور ہی خیال ہوا پر غلط ہوا۔ اور مجھ کو جو ہوا۔ وہ خود اپنی قوم کی حالت کا ابتر[3] ہونا تھا۔ قوم کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک[4] گڑھے میں پڑی تھی کہ ادھر اُدھر کی چیزیں تو درکنار وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ جس میں پڑی تھی۔ پھر میرا دل آخر دل ہی تھا۔ پتھر نہ تھا۔ جو نہ پگھلتا۔ اور اپنی قوم کی حالت پر غم نہ کرتا۔ ایک مدت تک اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجئے۔ جو خیالی تدبیریں کرتا تھا۔ کوئی بن پڑتی نہ معلوم ہوتی تھی۔ جتنی امیدیں کرتا تھا۔ سب لوٹ لوٹ جاتی تھیں آخر یہ سوچا۔ کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کر سکو۔ ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا۔ ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔ اس میں خدا کی طرف کا بدلہ تو نہ جب معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے مگر قوم کی طرف کا بدلہ اسی وقت سے معلوم تھا۔ جواب ظاہر ہے

---

[1] شیریں کا عاشق۔ جسے فرہاد کوہکن بھی کہتے ہیں ٭ [2] مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ مشہور مثنوی معنوی کے مصنف ٭ [3] حالت کی خرابی۔ بُرا ہونا ٭ [4] اندھیرے ٭

کافر[1]۔ مرتد[2]۔ ملحد[3]۔ زندیق[4] اسلام کا دشمن ۔ مسلمانوں کا ہاجی[5]۔ قوم کا عیب جو دین دنیا سے آزاد ۔ کہنا اور نام پر دو چار صلواتیں[6] سنا دینا اور ہم پر اس مثل کا صادق آنا کہ "دھوبی کا کتا ۔ گھر کا نہ گھاٹ کا" مگر شکر ہے ۔ کہ ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا۔ اور ہمیشہ ہمارے دل میں بھی رہا کہ اے خدا ان پر رحم کر ۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے ؛

انہی قومی بھلائی کے ولولوں میں سے تہذیب اخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا ۔ جس کا اصلی مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیاوی ابتر حالت کا جتلانا تھا اور سوتوں کو جگانا ۔ بلکہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا ۔ یقین تھا ۔ کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے بدبو زیادہ پھیلے گی ۔ مگر حرکت آجانے سے پھر خوشگوار ہو جانے کی توقع ہوتی تھی ۔ پس کیا ہم نے جو کچھ کرنا تھا ۔ اور پایا ہم نے جو کچھ کہ پانا تھا ۔ مگر خدا سے آرزو ہے کہ اگر ہم نے وہ نہیں کیا جو ہم کو کرنا تھا ۔ تو وہ وہی کرے ۔ جو اس کو کرنا ہے ؎

---

[1] اسلام سے انکاری ؛ [2] اسلام سے پھرا ہوا ؛ [3] الحاد پسند ؛
[4] کتاب ژند کا معتقد ۔ وہ شخص جو مطابق تعلیم ژند یزدان اور اہرمن کا قائل ہو ۔ یہ زندیک کا معرب ہے ۔ زند یا ژند زردشت کی کتاب ۔ اور ی و ک تصغیر ہے ۔ جو تحقیر کے معنے دیتا ہے ؛
[5] ہجو کرنے والا ؛ [6] گالیاں دینے والا ؛

**

از بندہ خضوع و التجا مے زیبد[1]

بخشائش بندہ از خدا مے زیبد

گر من کنم آنکہ مرا نازیباست

تو کن ہمہ آنکہ ترا مے زیبد

سات برس تک ہم نے بذریعہ اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی مذہبی بیجا جوش سے جس تاریک گڑھے میں چلی جاتی تھی۔ اُس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی۔ اس میں ان کو روشنی دکھلائی۔ مذہب اسلام پر نادانی[2] کی جس قدر گھٹائیں چھارہی تھیں۔ اُن کو مٹایا۔ اور اُس کے اصلی نور کو جہاں تک ہم سے ہو سکا۔ چمکایا۔ اُردو زبان کا علم ادب جو بد خیالات اور موٹے بھدّے الفاظ کا مجموعہ ہو رہا ہے اُس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا۔ ہم نے اصلاح چاہی۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست[3] میں ان باتوں میں بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی قومی عزّت۔ سلف آنر یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم ادب میں

---

[1] بندہ کے لئے زیبا ہے کہ وہ خدا سے التجا کرے اور خضوع وخشوع سے کام لے۔ اور بندہ پر بخشش کرنا حق تعالیٰ کیلئے زیبا ہے۔ اگر میں ایسے کام کرتا ہوں جو میرے لئے نازیبا ہیں۔ تو اے خدا تو وہ کر جو تیرے لئے زیبا ہے۔ (یعنی مجھے بخشش دے) [2] بیوقوفی اور جہالت ؛ [3] اپنی سمجھ کے مطابق ؛

واخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ مگر ہر طرف سے تہذیب شائستگی کا غلغلہ سُنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا۔ اُردو زبان کے علم ادب کا ترقی پانا۔ یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔ اب بہت لوگ جو ان باتوں کو پکارتے ہیں۔ گو اس وقت بظیڑی بظیڑی لہریں کھاتے ہیں۔ مگر پانی میں حرکت کا آجانا کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنی ہنسال میں آپ چورس رہے گا اس لئے مناسب ہے۔ کہ اب ہم بس کریں۔ اور پانی کو آپ ہی آپ چورس ہونے دیں ؛

ہمارے دوست ہماری اس خاموشی کا کوئی سبب دور از کار[1] خیال نہ کریں گے۔ اور نہ اس پر التفات[2] کریں گے جو ہمارے ناصح نور الآفاق[3] نے اپنے اخیر پرچہ میں لکھا تھا۔ بلکہ یہ خیال کرینگے کہ ہم کسی دوسری قومی بھلائی کے کام میں مصروف ہونگے۔ جو اس سے بھی زیادہ قوم کو مفید ہوگا۔ خدائے تعالے نے فرمایا ہے۔ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا" اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے ایسے دوست ہیں۔ جو اس پرچہ کے بند ہونے سے نہایت ہی شکستہ خاطر ہوں گے مگر ہم ان سے معذرت کرتے ہیں۔ اور اب اس پرچہ کو اُن سے رخصت کرتے ہیں۔ اور وہ دن بھی اب آنے والا

---

[1] ناقابل قبول ؛ [2] توجہ کرینگے ؛ [3] ایک اخبار کا نام ہے جو عام طور پر سر سید احمد خاں کے اخبار تہذیب الاخلاق کے مضامین کی تردید کیلئے جاری کیا گیا تھا ؛

ہے کہ ہم خود ہی ان سے رخصت ہوں گے ؛

ہم نے اپنے اس ارادہ سے بعض دوستوں کو مطلع کیا تھا[1]
اور جب اُن کو معلوم ہوگیا ۔ کہ ہم نے یہ ارادہ مصمم[2] کرلیا ہے ۔
تو انہوں نے ہمارے ان سات برس کے پرچوں کے ریویو لکھے ہیں[3]
جن کو ہم نہایت احسان مندی و شکر گذاری سے اس اپنے
اخیر پرچہ میں درج کرتے ہیں ۔ والسلام

ملک محمد عنایت اللہ
پروفیسر مشن کالج لاہور

---

[1] اطلاع دی تھی ؛ [2] مضبوط ۔ پکا ؛ [3] تبصرہ کیا ؛